سوانح عمری

صفی اورنگ آبادی

مری سوانح عمری بھی وہ کہانی ہے
کہ جس کے سننے سے آتے ہیں جسم پر کانٹے

مؤلف

محمد نورالدین خاں

سلسلۂ مطبوعات ادبستان دکن

نامِ کتاب .... سوانح عمری صفیؔ اورنگ آبادی

مؤلف .... محمد نورالدین خاں

کتابت .... سیّد منظور محی الدین کلیانوی

طباعت .... اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن

سنہ اشاعت ١٩٨٩ء

قیمت .... بیس روپے (٢٠ روپے)

ناشر

محمد نورالدین خاں
دیوڑھی نواب مشرف جنگ فیاضؔ
چبوترہ سیّد علی۔
مکان نمبر 20-6-356
فون نمبر 526423

حضرتِ صفی اورنگ‌ابادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

وجہ تحریک تالیف

جناب صفیؔ اورنگ آبادی کو ایک دو بار مشاعرہ میں پڑھتے سنا اور ایک آدھ مرتبہ انہیں بازار میں دیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن ان کی خدمت میں حاضر ہونے، قریب سے دیکھنے، ساتھ اُٹھنے بیٹھنے یا ان کی باتیں سُننے کا کبھی موقع نہیں ملا۔ کسی شخصیت کے عادات و اطوار علم و فضل ذہانت، رازہائے درونِ خانہ اور گفتنی و ناگفتنی حالات اور روز و شب کی باتیں لکھنے کے فرض سے وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جسے اس شخصیت سے واسطہ پڑے۔ جو کچھ میں نے جناب صفیؔ پر لکھا ہے اس کی بنیاد سنی سنائی باتوں پر ہے یا ان پر لکھے گئے مضامین یا پھر جناب صفیؔ کے چند خطوط اور تحریروں سے میں نے استفادہ کیا ہے۔

اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ شاگردانِ صفیؔ جناب شمس الدین تاباں مرحوم اور جناب سید عبدالحفیظ میرے قدیم ہم محلہ بزرگوں میں ہیں مجھے سنہ ۱۹۷۰ء میں وظیفہ ہوا تو ان صاحبِ ذوق اصحاب سے رات دن ملاقاتیں ہونے لگیں ان ہی یادگار صحبتوں میں، میں جناب صفیؔ کے شاعرانہ کمال اور ان کی ہمہ داں شخصیت اور حالاتِ زندگی سے واقف ہوا ذکرِ صفیؔ کا وظیفہ زیادہ چلتا تھا۔ جناب تاباںؔ کو اپنے اُستاد صفیؔ سے کچھ ایسی والہانہ وابستگی اور گرویدگی تھی کہ اپنے اُستاد کا ذکر کرتے ہوئے اکثر بے ساختہ اشکبار ہو جاتے۔

جناب تاباں ادبستانِ دکن کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی وہ اس انجمن کے معتمد تھے۔ ادبستانِ دکن نے جناب تاباں کے جمع کردہ کلامِ صفیؔ کو کلیاتِ صفیؔ کے

نام سے شائع کرنے کی تحریک منظور کی تو اخبارات میں روداد لغرض اشاعت روانہ کی گئی یہ اطلاع شائع ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ جناب ابوالنصر محمد خالدی مرحوم (سابق ریڈر تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ) کا ایک خط بنام رؤف رحیم نائب معتمد دبستان دکن وصول ہوا :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

مکرمی ! حضرت صفی اورنگ آبادی مرحوم و مغفور کے خادموں میں یہ عاجز بھی ہے "فردوس صفی" یا "پراگندہ" کے بارے میں مجھے بھی خصوصی لگاؤ اور دلچسپی ہے۔ اس عاجز کی عمر ستر سے متجاوز ہے۔ خود زیادہ چلنے پھرنے سے معذور ہوں۔ مناسب خیال فرمائیں تو میرے گھر تشریف لائیں میں صبح آٹھ تا بارہ مل سکتا ہوں۔ اتوار اور جمعہ مصروفیت رہتی ہے

30-11-1404 السلام مع الاکرام

ابوالنصر محمد خالدی

اس خط کو پڑھ کر ہم سب کو جناب خالدی سے ملنے کا انتہائی اشتیاق ہوا۔ چنانچہ بہت جلد ان سے ملنے کا طے کر کے ایک روز صبح دس بجے جناب تاباںؔ جناب سید عبدالحفیظ، جناب رؤف رحیم (فرزند تاباں) اور یہ راقم ان کے مکان واقع مہدی پٹنم حاضر ہوئے اور خط کے حوالے سے ان سے ملاقات کی۔ جناب خالدی میرے والد اور تایا نواب عزیز یار جنگ عزیزؔ کو نہ صرف جانتے تھے بلکہ ان سے اچھی خاصی ملاقات بھی تھی۔ اس حیثیت سے وہ مجھے جانتے تھے اگرچہ ان سے ملے ہوئے کئی برس ہوگئے تھے لیکن تھوڑے سے تامل کے بعد انہوں نے مجھے پہچانا میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ سب سے بڑی خندہ پیشانی سے ملے چائے بسکٹ وغیرہ سے تواضع کی اس نشست میں صفیؔ مرحوم کا ہی تذکرہ رہا۔ انہوں نے بتایا کہ سنہ ۱۹۲۶ء سے ان کے تعلقات جناب صفیؔ سے مخلصانہ رہے اور آخری زمانے تک ان میں کوئی کمی نہیں آئی صفیؔ کے ابتدائی دور کی بہت سی دلچسپ اور اہم باتیں انہوں نے سنائیں۔ بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ کلیاتِ صفیؔ شائع ہو رہا ہے۔

اس نشست کے بعد ہم سب گھر واپس ہوئے لیکن راستہ تمام مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کیوں نہ جناب صفیؔ کے وہ تمام حالات زندگی قلمبند کر لئے جائیں جن سے

جناب خالدی واقف ہیں۔ گھر آیا تو یہی سوچتا رہا کہ جناب صفی کی شاعری اور ان کے فن پر مضامین لکھے گئے ہیں اور ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔

لیکن ان کے حالاتِ زندگی پر بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ جناب صفی کے قدیم دوست اور شاگرد ایک ایک کر کے دنیا سے اٹھتے گئے کسی نے کچھ نہیں لکھا اور نہ کسی تذکرہ نویس نے ان اصحاب سے استفادہ کی کوشش کی۔ ان حالات میں جناب خالدی کی موجودگی بسا غنیمت اور باقیات الصالحات میں تھی میں نے ارادہ کر لیا کہ وقت کو ضائع کئے بغیر موقع کو غنیمت جان کر اس کام کا بیڑہ اٹھاؤں۔

ایک دن اسی جذبہ کی شدت سے مجبور ہو کر میں جناب خالدی کے درِ دولت پر حاضر ہوا اور اپنی خواہش کا اظہار ان سے کیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا وہ بخوشی راضی ہو گئے اور مجھے مقررہ دن اور اوقات میں آنے کی اجازت دی۔

جب بھی میں جناب خالدی کے ہاں جاتا ان کے حسب الحکم ایک کاغذ پر دریافت طلب امور لکھ کر لے جاتا اور جو جوابات جناب خالدی بیان کرتے لکھ لیتا تھا میرے کئی استفسارات اور بچکانی سوالات کا جواب وہ کسی خفگی یا اکتاہٹ بہت دلچسپی سے دیتے تھے۔ میرے ہمراہ اکثر جناب صفی کے ارادت مند شاگرد اور میرے مخلص دوست سید عبدالحفیظ بھی ہوتے تھے اس طرح جناب خالدی کے بیان کردہ واقعات کے وہ بھی ایک چشم دیدہ اور گوش شنیدہ گواہ ہیں۔

ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہا۔ یہ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا کئی عوارض تھے، بہت کمزور ہو گئے تھے۔ پیری و صد عیب کی تصویر بن گئے تھے۔ اس لئے بڑی احتیاط کی زندگی تھی۔ لیکن شوقِ علم و تحقیق کا جذبہ جوان بنائے رکھا تھا۔ ساری مجبوریاں پسِ پشت ڈال دیتے تھے۔ قرآن پر تحقیقاتی کام میں مصروف رہتے۔ بہت کم کسی سے ملتے اور بات بھی کم کرتے۔ مقررہ اوقات میں کسی سے ملتے نہ تھے ان کی افتادِ طبیعت بھی کچھ ایسی ہی تھی لیکن

میں جاتا تو میرے لئے ضرور وقت نکالتے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ میرا آنا ان کے لئے بارِ خاطر ہے۔ بڑی خوش مزاجی اور بزرگانہ شفقت سے باتیں ہوتیں۔ چائے خوری کا بڑا خاص ذوق تھا۔ پیتل کی کشتی، اندر کپڑا پڑا ہوا۔ بڑا سا چائیدان اوپر ٹی کوزی، دودھ دان پیالی طشتری اور تھوڑے بسکٹ، اپنے ہاتھ سے چائے بنا بنا کر پلاتے پرانے دور کی یاد تازہ ہو جاتی اس ڈھنگ سے چائے پلاتے کہ وضع داری میں کوئی فرق نہ آیا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک پیالی منگوا کر پلایا ہو۔

کبھی ان کو بہت مصروف دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ میرے آنے سے ان کے تحقیقاتی کام میں خلل اندازی ضرور ہوئی ہوگی۔ ایسے ہی ایک دن میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے علمی اور مذہبی کام میں مصروف رہتے ہیں اور مجھے شرم آتی ہے کہ آپ سے یہ پوچھوں کہ کیا آپ جناب صفیؔ کے ساتھ کمپاونڈ (سیندھی خانہ) بھی جاتے تھے وہ فرماتے "ایسا مت سمجھو ضرور پوچھو۔ آپ بھی ایک اہم کام کر رہے ہیں صفیؔ مرحوم پر میں لکھنا چاہتا تھا مجھ سے نہ ہو سکا۔ آپ ضرور لکھیے" اس طرح وہ میری ہمت افزائی کرتے۔

جناب خالدی شاعر نہ تھے، البتہ اُردو فارسی ادب و شاعری کی کتابیں جناب صفیؔ کے ہاں پڑھی تھیں۔ اس لئے وہ صفیؔ کو "مولوی صاحب" سے مخاطب ہوتے تھے۔ جناب خالدیؔ کا نام محمد شرف الدین خاں ہے۔ شوقِ علمی کو دیکھ کر جناب صفیؔ نے ابوالنصر کا خطاب دیا تھا تاریخ اسلام کے اسکالر تھے اس لئے انہوں نے نئے نام میں محمد کے بعد سپہ سالار عساکر اسلام خالد بن ولیدؓ کے نام کی نسبت سے خالدی رکھنا پسند کیا اگرچہ وہ کم سخن اور کم گو تھے وقت اور حالات نے بجھا سا دیا تھا علمی مصروفیت کے باعث روکھا پن طبیعت میں آگیا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ جناب صفیؔ کا ذکر کرتے سب بالائے طاق ہو جاتا۔ وہ بڑے زندہ دل نظر آتے اور فطری ذہانت اور شگفتہ مزاجی کے جوہر چمکنے لگتے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے جوانی عود کر آئی ہے ایک دن نہ جانے کیا جی میں آئی کہنے لگے چلئے آپ کو وہ مکانات دکھائیں جہاں جہاں صفی مرحوم رہتے تھے۔ ان مقامات کی سیر کرائیں جہاں مشاعرے ہوتے اور صفی مرحوم نے معرکۂ سخن

جیتا۔ چنانچہ ایک دن میں اور جناب حفیظ ان کے ہمراہ ان مکانات اور مقامات کو دیکھا۔ رکاب گنج (دوبر وہائی کورٹ) سوق میر کی کمان دیوڑھی عالم علی خاں پنچھی براق۔ مغل پورہ کمان کا مکان۔ غرض سب کچھ دکھایا اور وہ تمام واقعات سُنائے جب وہ صفی مرحوم اور ان کے والد اور والدہ کے ساتھ ان مکانوں میں رہتے تھے اور ضرورۃً ان کی خدمت کردیا کرتے تھے۔ گھر میں ان سے گوشہ پردہ نہ تھا۔ ایسے گہرے روابط کو دیکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا صفی آپ کے دوست تھے۔ لیکن صفی کی عظمت اور احترام ان کے دل میں ایسا تھا کہ میرے پوچھنے پر انہوں نے جھٹ ہاتھ کانوں پر رکھا اور فرمایا نہیں میاں میں ان کا دوست نہیں ادنیٰ خادم ہوں۔

وہ جناب صفی کو غزل کا ایک بلند پایہ شاعر سمجھتے تھے اور ان کے فن کے بہت مداح تھے یہ بھی کہتے تھے کہ بحیثیت انسان ان میں بعض کمزوریاں بھی تھیں لیکن ان کی صلاحتیں خداداد تھیں اور ذہانت خدا کی دین تھی۔ فرماتے تھے کہ زندگی میں تین آدمیوں کو دیکھا جو واقعی بڑے ذہین تھے۔ ایک صفی مرحوم دوسرے مفتی اشرف علی اور تیسرے ایک اڈوکیٹ (اڈوکیٹ کا نام وہ بھول گئے تھے)

جناب خالدی نے جب کالج میں داخلہ لیا تو تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے شادی ملازمت اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے مصر جانا پڑا۔ مصر سے آنے کے بعد وہ جامعہ عثمانیہ میں لکچرار اردو اور پھر ریڈر تاریخ اسلام ہوئے ان کی سکونت بھی جامعہ عثمانیہ کے کوارٹرس میں رہی۔ اس دوران میں صفی مرحوم سے ان کی ملاقاتیں برائے نام رہیں۔ لیکن جناب صفی اور جناب خالدی کے روابط میں جو خلوص اور جو ایک دوسرے کیلئے عزت کا جذبہ تھا ان میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جناب خالدی فرماتے تھے کہ جناب صفی نے اپنی ایک تصویر ازراہ شفقت انہیں عطا کی تھی جس پر ان کی تحریر اور دستخط تھے اس تصویر کا عکس جناب رفعت کی کتاب "انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" میں موجود ہے۔

میرے مضامین کی بنیاد تمام تر جناب خالدی کے انٹرویو پر ہے اور ان مضامین کے

لکھنے کی وجہ تحریک بھی جناب خالدی کی شخصیت رہی۔ میرے کچھ مضامین کو موصوف نے دیکھا بھی تھا۔ لیکن افسوس کہ ان کا انتقال ۳ نومبر ۱۹۸۵ء ہو گیا۔ انتقال سے ایک ہفتہ پہلے میں حاضر خدمت ہوا تھا تو پلنگ پر لیٹے لیٹے پوچھا کہ کیا صفی پر میں نے کام تکمیل کر دیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ذرا طبیعت ٹھیک ہو تو مسودے ان کی خدمت میں پیش کروں لیکن ان کی اچانک موت نے مہلت نہ دی۔

جناب خالدی کے علم و فضل اور مرتبہ کا تعین میرے لئے چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف ہے۔ انتقال سے ایک ماہ قبل ان کے ایک شاگرد سید ابراہیم صاحب ندوی نے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کو جناب خالدی کی خرابی صحت کی اطلاع دی تھی تو مولانا نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے: ــ

محب کرم۔ سلام مسنون 6TH SEPT. 1985

عنایت نامہ ۲۳ ر اگسٹ ۳۰ ر اگسٹ کو ملا۔

مولانا ابوالنصر محمد خالدی صاحب مسلمانوں اور ہندوستان کا علمی سرمایہ اور قیمتی متاع ہیں۔ میں ان کی دقت نظر اور تحقیقی کاموں کا پرانا قدرداں۔

ان کی علالت کی اطلاع سے تکلیف ہوئی۔ یہ بیماری بڑھاپے کی عام بیماری ہے اللہ تعالیٰ تمام امراض سے شفا عطا فرمائے۔

محترمی خالدی صاحب کی صحت سے مطلع کیجیے۔

مخلص
ابوالحسن علی

جناب صفی کے حالاتِ زندگی کے معلومات کا ماخذ بہت ہی معتبر اور مستند ہے صفی سے دلچسپی رکھنے والوں کی خوش قسمتی ہے کہ جناب خالدی جیسا عالم اور محقق ان واقعات کا راوی ہے ابتدائی دور کے حالات لکھنے کے بعد میری خواہش یہ رہی کہ جناب صفی کے آخری دور کے حالات بھی معلوم کروں تاکہ اس ابتداء کی انتہا بھی ہو جائے اور کتاب زندگی کا

آخری ورق سادہ نہ رہ جائے۔

واقف کار اصحاب نے جناب صفی کے شاگرد جناب غلام محبوب خاں مسلم کی نشاندھی کی۔ میرے دوست جناب سید عبدالحفیظ نے ان کے مکان واقع شمس الامراء (شاہ گنج) نے جاکر ان سے میرا تعارف کرایا۔ موصوف سے کئی ملاقاتیں رہیں۔ بڑی مستعدی اور دلچسپی سے موصوف نے تعاون کیا۔

جناب مسلم نے بیان کیا کہ ۱۹۵۱ء میں وظیفہ کے بعد وہ استاد صفی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلام پر اصلاح لی۔ گھر بھی وہیں مغل پورہ میں قریب تھا۔ اس لئے رات دن حاضر خدمت ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ۱۹۵۴ء میں جناب صفی کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح شاگردی کی مدت صرف تین سال ہی رہی۔ لیکن ان تین سالوں میں استاد صفی کو قریب سے دیکھنے اور ان کی ہمنشینی کا شرف ملا۔ استاد صفی جناب مسلم کی عزت کرتے اور ان پر شفقت و اعتماد کرتے تھے۔ اس طرح میرے مضامین کا بہت سا اہم مواد جناب مسلم کا فراہم کردہ ہے۔ اگر جناب مسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہ ملتا تو سارا مضمون تشنۂ تکمیل رہتا۔

جناب خالدی مرحوم نے جناب صفی کے خطوط جمع کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ ان خطوط کو شائع کریں اس وقت صفی بقید حیات تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو پسند کیا تھا اور انہوں نے چند خطوط اور تحریریں جناب خالدی کو فراہم کیں لیکن وقت نے ساتھ نہیں دیا اور ایک اہم ادبی کام کی تکمیل نہ ہو سکی۔

جناب خالدی نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جمع کردہ خطوط اور تحریریں ادارہ ادبیات اردو میں جمع کرا دیں تاکہ دوسروں کو استفادہ کا موقع ملے۔ موصوف کی نشاندہی پر ادارہ ادبیات اردو میں جمع اس ادبی سرمایہ کو دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ یہ چند خطوط میرے لئے جناب صفی کے واقعات زندگی کی اہم کڑیاں ثابت ہوئیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعر کے کلام میں اس کی زندگی کے ظاہری اور باطنی اشکال کی

مُنہ بولتی تصویریں متحرک نظر آتی ہیں ؎

صفیؔ ذوقِ سخن ہے جن کو مجھ سے بھی کبھی سُن لیں
جو سمجھیں گے کچھ تو کچھ مرے اشعار سمجھیں گے

صفیؔ نے اشعار میں وارداتِ قلبی اور اپنی طرزِ زندگی کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے ؎

صفیؔ میں کیا کہوں ان دوستوں سے جو یہ کہتے ہیں
کہ تیری زندگی کچھ اور تری شاعری کچھ اور ہے

آخر میں میرا فرض ہے کہ میں اپنے بزرگ دوست جناب سید عبدالحفیظ صاحب اور جناب شبلی یزدانی صاحب کا شکریہ ادا کروں اگرچہ اس بات کا احساس ہے کہ شکریہ کے الفاظ ان کے مشوروں رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی وقعت سے فروتر ہیں برادرم محمد بدرالدین خاں صاحب، جناب رؤف رحیم معتمد ادبستان دکن اور مرے دوست جناب محمد ابراہیم شریف کا بھی بہت ممنون ہوں جن کا مخلصانہ تعاون ہمیشہ مجھے حاصل رہا۔ فقط

محمد نورالدین خاں

دیوڑھی نواب مشرف جنگ فیاض
مکان نمبر 356 - 6 - 20
چبوترہ سیّد علی - حیدر آباد دکن
فون نمبر (52 6423)

۱۵؍رجب المرجب ۱۴۰۹ھ
۲۲؍فروری ۱۹۸۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم ؕ

ابتدائی حالات

حضرت صفی اورنگ آبادی کی تحریر اس وقت پیشِ نظر ہے۔ فرماتے ہیں سُنّی ہوں حنفی ہوں۔ صدیقی ہوں۔ اورنگ آبادی ہوں۔

میں تو صدیقی ہوں لیکن نام کے آگے صفی　　لوگ لکھدیتے ہیں مجھ کو میرزا و میر بھی

کاپی نویس ہوں، آبائی پیشہ کے لحاظ سے حکیم ہوں، منشی نہیں، مولوی نہیں، مرفہ حال نہیں ملازم نہیں متاہل نہیں شاعروں میں سودائی ہوں اور عاشقوں میں مجنوں۔

میرا حال کا نام بہاء الدین ہے مگر ایک بزرگ نے بہبود علی نام رکھا تھا۔ اُن کی زبان کا اثر کہیئے یا والدین کی پسند کہ اِس نام سے مشہور ہوں۔ گھر کا نام "میاں جانی" ہے۔

آیئے اِس آئینہ تحریر میں صفی اورنگ آبادی کے حالات زندگی کا عکس دیکھیں!

شہر گجرات

گجرات کا نام سنتے ہی ذہن کے پردے پر سیٹھ ڈالمیا، ٹاٹا، برلا اور دوسرے تجارت پیشہ مہاجن اور صنعت کاروں کا تصوّر ابھرتا ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ گجرات زمانہ قدیم سے ہی دولت کا مرکز، علم و فضل کا گہوارہ اور اولیائے کرام کا سرچشمۂ ہدایت رہا ہے گجرات جب سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا تو باشندگانِ گجرات کی آمد و رفت دِلی۔ سندھ اور دوسرے شہروں میں ہونے لگی۔ شہنشاہ اورنگ زیب نے دولت آباد کو پایۂ تخت بنا کر اسے اپنے نام سے شرف بخشا تو نئے شہر اورنگ آباد میں کاملانِ فن اقطاع ہند سے آ آکر آباد ہونے لگے۔

صفی کے والد کی اورنگ آباد میں آمد و سکونت:۔ صفی کے والد حکیم منیر الدین صاحب

حصولِ علم کی خاطر گجرات سے آ کر شہر اورنگ آباد میں مقیم ہوئے اور پھر طب کی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ لے کر دِلّی کا سفر اختیار کیا چند سال طب کی تعلیم دِلّی اور علی گڈھ میں مستند حکماء سے حاصل کر کے اورنگ آباد واپس ہو گئے اور باقاعدہ حکمت شروع کر دی شادی بھی اورنگ آباد میں ہو گئی اور یہیں اُن کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تولد ہوئی۔

صفی کی پیدائش :- صفی کے شاگرد جناب غلام محبوب خاں صاحب مسلم بیان کرتے ہیں کہ اُن سے صفی نے فرمایا کہ اُن کے والد حکیم منیرالدین صاحب نے " ذی قسمت " سے اُن کی تاریخ پیدائش نکالی تھی۔ جس کے اعداد ابجد کے حساب سے ۱۳۱۰ ہجری ہوتے ہیں۔ تمام تذکرہ نگاروں نے اسی سنہ کو صفی کا سنہ پیدائش بغیر کسی اختلاف کے تسلیم کیا ہے۔

تاریخ پیدائش :- سنہ ولادت ۱۳۱۰ ہجری (تیرہ سو دس) ہونے سے کسی کو اختلاف نہیں کیوں کہ یہ خود صفی کا فرمودہ ہے۔ البتہ ہمارے اپنے نزدیک روزِ پیدائش قابلِ غور ہے تذکرہ مرقعِ سخن جلد اول میں صاحبزادہ میر اشرف علی خاں نے اپنے مقالہ " محمد بہبود علی صفی اورنگ آبادی " میں اُن کی تاریخ پیدائش ۲۶ رجب ۱۳۱۰ ہجری لکھی ہے۔ حضرت صفی پر مضامین لکھنے والوں نے بھی اس تاریخ پیدائش کی توثیق کی ہے۔ ہم بھی اس تاریخ کو بے چون و چرا مان لیتے لیکن صفی کے ایک شعر نے ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

کون لے پیرا کہے گا اے صفی ۔۔۔ روزِ پیدائش ہی میرا پیر ہے

جب خود صفی نے کہا ہے کہ وہ پیر کے دن پیدا ہوئے تھے تو از روے جنتری سنہ ہجری عیسوی اور فصلی پیر اور منگل کو حسب ذیل تواریخ ہوتے ہیں :-

پیر = ۲۵ رجب ۱۳۱۰ھ ۱۴ فروری ۱۸۹۳ء ۱۲ فروردی ۱۳۰۲ ف

منگل = ۲۶ رجب ۱۳۱۰ھ ۱۵ فروری ۱۸۹۳ء ۱۳ فروردی ۱۳۰۲ ف

صاف ظاہر ہے کہ پیر کے دن ۲۵ رجب آتی ہے ۲۶ رجب نہیں یہ بات اگرچہ چھوٹی معلوم ہوتی ہے لیکن ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ایک دن کے فرق کی غلطی بھی کیوں رہے۔

صفی کا نام :- صفی کے نام کے بارے میں مختلف آرا ہمیں ملتے ہیں۔ صاحبزادہ

رس رس

میر اشرف علی خاں صاحب۔ مرقع سخن میں رقمطراز ہیں:۔

"نام محمد بہاؤ الدین مشہور بہبود علی' تخلص صفی .... بہبود علی اُن کا خود اختیار کردہ نام ہے۔ اُن کے اصلی نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں"

مخفی مبادکہ صاحبزادہ صاحب نے اپنا مقالہ اس وقت لکھا جب صفی بقید حیات تھے وہ خود صفی سے اُن کے صحیح نام کی تحقیق کر سکتے تھے۔

یادگار صفی "سب رس" ماہ مارچ و اپریل ۱۹۵۶ء مرتبہ ادبیات اُردو حیدرآباد میں "صفی اورنگ آبادی اور اُن کی شاعری کے" عنوان سے جناب منیر صفوی صاحب کا مضمون موجود ہے۔ موصوف کی تحقیق ہے کہ "نام بہاؤ الدین تھا لیکن بعد میں خود انہوں نے اپنا نام مرزا بہبود علی رکھا" نام کے آگے "مرزا" لکھا دیکھ کر صفی کا شعر ہمیں خندۂ زیرلب کے ساتھ یاد آ گیا ؎

میں تو صدیقی ہوں لیکن نام کے آگے صفی — لوگ لکھ دیتے ہیں مجھ کو مرزا و میر بھی

جناب سید مبارز الدین صاحب رفعت مرحوم یم۔اے (عثمانیہ) نے اپنی کتاب "انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" مرتبہ و مطبوعہ ۱۹۶۳ء (اُنیس سو ترسٹھ) میں لکھا ہے "حضرت صفی اورنگ آبادی ۲۶ رجب ۱۳۱۰ھ کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ والد نے محمد بہاؤ الدین نام رکھا۔ لیکن آگے چل کر انہوں نے اسے ترک کر کے بہبود علی نام اختیار کیا"۔

اتفاق کہئیے یا خوش قسمتی کہ صفی کی ایک تحریر ہمیں ملی جس کا عکس ہمارے ہاں موجود ہے۔ یہ تحریر اُن کے نام کی تحقیق کے سلسلہ میں بڑی مددگار ثابت ہوئی ہے ورنہ صحیح نام کے تعین میں غلط فہمیاں باقی رہتیں۔ صفی لکھتے ہیں "میرا اصل کا نام بہاؤ الدین ہے، مگر ایک بزرگ نے بہبود علی نام رکھا۔ اُن کی زبان کا اثر کہئیے یا والدین کی پسند کہ اس نام سے اب مشہور ہوں۔ گھر کا نام میاں جانی ہے"۔

امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ کا دیوان "معین سخن" ۱۹۲۸ء میں جب مرتب و شائع ہوا تو

صفی اسوقت دربار معین سے وابسطہ تھے۔ تاریخ طباعت دیوان جہاں کئی شعراء کے معین سخن میں موجود ہیں وہاں صفی کی بھی تاریخ درج ہے۔ صفی کا نام اُن کی لکھی ہوئی تاریخ پر اس طرح لکھا ہوا ہے :۔
"صفی مولانا حکیم بہاؤالدین بہبود علی صدیقی صاحب اورنگ آبادی"۔
یہ یقینی بات ہے کہ اپنا پورا نام صفی ہی نے لکھ کر دیا ہوگا! ایک روایت یہ بھی ہے کہ مشہور بزرگ حضرت شیخ بہاؤالدین نقشبندیؒ کا نام عقیدتاً اس لئے اختیار کیا کہ کوتاہیاں دُور ہوں اور اس نام کی برکت سے نیک توفیق ہو بہرحال کچھ بھی ہو جیسا کہ خود صفی نے فرمایا کہ بزرگ کی زبان کا اثر یا والدین کی پسند کہ بہبود علی کے نام ہی سے مشہور ہوئے اُن کا اپنا رکھا ہوا نام شہرت نہ پا سکا۔ اپنی ایک رباعی میں اپنا نام بہبود علی بتلاتے ہیں :۔

چرچے اُن کے گلی گلی ہو جاتے — کچھ اور ہی بہبود علی ہو جاتے
بدنام کیا صفی کو میخواری نے — بے عیب نہ ہوتا تو ولی ہو جاتے

صفی اورنگ آباد (نواب پورہ) میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے اپنی جائے پیدائش سے اس درجہ دلی اُنس تھا کہ اپنے نام یا تخلص کے ساتھ ہمیشہ "اورنگ آبادی" ضرور لکھتے تھے ؎

تری محفل میں تو موجود ہیں سب — صفی اورنگ آبادی کہاں ہے

جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے صفی نے شہر حیدرآباد سے بہت دُور دو مقامات کا سفر کیا تھا ایک اورنگ آباد کا دوسرا نواب معین الدولہ کے ہمراہ بنگلور کا جناب سید مبارز الدین رفعت مرحوم نے بتایا ہے کہ بچپن ہی میں اورنگ آباد چھوٹ گیا اور مرنے تک ایک آدھ بار کے سوا انہیں اورنگ آباد جانے کا موقع نہ ملا۔ ایک شعر میں فرما گئے ہیں ؎

آدھی صدی کو پانچ برس ہی تو کم رہے — شاباش کب صفی کو خیال وطن ہوا

یہ کہنا مشکل ہے کہ کس سنہ میں وہ اپنے وطن اورنگ آباد تشریف لے گئے تھے۔ البتہ ایک

کارڈ جناب خالدی مرحوم کے نام موجود ہے۔ اُس کارڈ کے چند جملے قابل غور ہیں:-
"مجھے آج آئے ہوئے تیسرا دن ہے۔ یہاں کے در و دیوار کاٹنے کو تو نہیں آتے بستی بارونق و دلچسپ ہے۔ میں جس بنگلہ میں ٹھہرا ہوں وہ بالکل ریلوے گیٹ کے سامنے ہے۔ ابھی تک میں نے گھر سے نکل کر بازار وغیرہ کی سیر نہیں کی اور نہ قلعہ دیکھا۔"
کارڈ پر تاریخ درج نہیں ہے نہ مقام کا نام کہ کہاں سے لکھا ہے، لیکن مندرجہ جملوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بحیثیت ایک مُسافر دور دراز مقام سے لکھا ہے۔ پوسٹ کارڈ پر البتہ ٹپہ خانہ پتھر گھٹی کی مُہر لگی ہوئی ہے اور تاریخ ۲۸ آبان سنہ ۱۳۳۹ ثبت ہے۔ اگر آدھی صدی کو پانچ برس کم کے ادعا پر غور کریں تو قرین قیاس یہ ہے کہ پوسٹ کارڈ اورنگ آباد ہی سے لکھا ہوگا۔

افسوس! اس وقت نہ خط کے کاتب رہے نہ مکتوب الیہ۔ کس سے پوچھیں جو کچھ ہم نے لکھا ہمارا قیاس ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ اتفاق کریں۔

صفیؔ کے والد کی شہر حیدرآباد میں آمد:- اعلحضرت غفران مکاں نواب میر محبوب علی خاں کا عہد میمنت مہد تھا۔ بادشاہ اور امراء کی سرپرستی اور قدردانی کی بدولت اہل علم و فن بصد شوق جوق در جوق حیدرآباد آرہے تھے۔ فن طب کی ترقی میں شاہانِ آصفیہ نے بڑی دلچسپی لی اور کارہائے نمایاں انجام دیے اور پھر طب کی معجز نمائیوں نے حکماء کی بے پناہ قدر و منزلت اور عوام کے دلوں میں بڑھادی۔

اِن اُمید افزا حالات میں حکیم منیر الدین صاحب نے شہر حیدرآباد کے لئے رختِ سفر باندھا اور مع اپنے مختصر خاندان جو ایک بیوی اور دو چھوٹے بچوں پر مشتمل تھا اورنگ آباد سے حیدرآباد تشریف لائے اور قدیم محلہ مستعد پورہ (سبزی منڈی) میں ایک کرایہ کے مکان میں قیام پذیر ہوئے اور یہیں اپنے مکان میں مطب کا آغاز کیا۔

اُن کے شہر حیدرآباد آنے کا ایک سبب نواب افسر الملک سپہ سالار افواج آصفی کی ذاتِ گرامی بھی تھی جو اورنگ آباد کے متوطن تھے اور حکیم صاحب سے اُن کے مراسم

بڑے دوستانہ تھے۔ یہ قرین قیاس ہے کہ نواب[6] صاحب کی تحریک بھی اُن کے عزم حیدرآباد کا سبب بنی ہو۔

صفیؔ کا بچپن اور دیگر واقعات

اپنے والد کے ساتھ جب صفیؔ حیدرآباد
آئے تو اُن کی عمر سات سال تھی۔ اس طرح یہاں آنے کا سنہ ۱۳۱۷ھ ہوتا ہے۔ صفیؔ کی والدہ ان کو بہت چاہتی تھیں۔ کبھی صفیؔ کھیلتے کھیلتے گھر سے نکل جاتے تو وہ پریشان ہو جاتیں اور محبتِ مادری سے مجبور ہو کر اُن کو ڈھونڈنے مردانہ لباس پہن کر گھر سے نکلتیں۔ یہ واقعہ خود صفیؔ نے جناب خالدی سے بیان کیا تھا۔ تقریباً دس سال کی عمر ہو گی اُن کی والدہ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور وہ شفقتِ مادری سے محروم ہو گئے۔ والدہ کی تدفین مستعدپورہ کے ایک قبرستان میں ہوئی۔

صفیؔ کے والد کا ذریعہ معاش طبابت و حکمت تھا اس لئے وہ ان مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے فرزند صفیؔ کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ ماں کے لاڈ و پیار نے اُن کو ضدی لاپروا اور لاؤ بالی بنا دیا تھا۔ والد کی عدم نگرانی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ ان کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہو سکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اکثر گھر سے غائب رہنے لگے۔ اس عرصہ میں والد نے اپنی لڑکی (صفیؔ کی بہن) کی شادی کر دی۔ وہ صاحب اولاد بھی ہوئیں۔ صفیؔ کے قدیم دوستوں اور شاگردوں نے ان کے خواہرزادوں کو دیکھا بھی ہے۔

حکیم منیر الدین صاحب کا عقدِ ثانی: ــ حالات بتاتے ہیں کہ صفیؔ میں لاأبالی پن فطرتاً موجود تھا۔ والدہ کا سایہ لڑکپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا اور اپنے پیشہ طب کی مصروفیت کی وجہ ~~اُن~~ وجہ اُن کے والد کی عدم نگرانی نے صفیؔ کو لاپروا اور شوریدہ سر بنا دیا۔ ان کے والد کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھلائی اس میں دیکھی کہ صفیؔ کو ازدواجی بندھنوں میں باندھ دیں تاکہ احساس ذمہ داری سے وہ بھٹکنے نہ پائیں اس لئے انہوں نے اپنے لڑکے کے لئے لڑکی کی تلاش شروع کی۔ آخر انہوں نے

ایک لڑکی کو اپنی بہو بنانا پسند بھی کیا۔ لیکن یہ واقعہ ایک معمہ ہے کہ کیوں اور کس لئے اس لڑکی سے اُن کے والد نے عقد ثانی کر لیا!

عاشقی کا جھوٹا افسانہ:- جو واقعہ اوپر درج ہوا ہے وہ ایک حقیقت ہے لیکن دُنیا جسے چاہتی ہے افسانہ بنا دیتی ہے اس واقعہ پر یار لوگوں نے بغیر جانے بوجھے اور بغیر تحقیق خوب خوب حاشیہ آرائی کی اب تک یہ افسانہ حقیقت بنا ہوا ہے۔ اور میں نے معتبر اشخاص سے یہی سُنا کہ صفی ایک لڑکی سے والہانہ عشق فرماتے تھے۔ محبّت بڑھتے بڑھتے نوبت شادی کی پہنچی تھی کہ اُن کے والد نے خود اپنے لڑکے کی محبوبہ سے شادی رچالی اور صفی ہاتھ ملتے رہ گئے اور یہ کہ انہوں نے اپنے عشق کی ناکامی کو نہایت صبر و تحمل اور بڑے ظرف سے برداشت کیا۔ والد کے شادی کر لینے کے بعد اپنی محبوبہ کو ماں کا درجہ دے کر ایک اعلیٰ مثال قائم کر دی۔

اِس قسم کے خیالی بے سرو پا باتوں سے صفی کے والد پر الزام آتا ہے اور صفی پر بھی تہمتِ عشق لگتی ہے۔ یہ افسانہ یونہی اس لئے مشہور ہو گیا کہ صفی ہزار سادگی پسند سہی لیکن اُن کی طبیعت میں ایسا رکھ رکھاؤ اور بھاری پن تھا کہ شاگردوں کو تو چھوڑیئے ان کے کسی قریبی بے تکلف دوست کو بھی ان کے خانگی اور گھریلو باتوں کے دریافت کی مجال نہ ہوتی تھی یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جناب خالدی کی ذات گرامی ہمارے درمیان موجود ہے (افسوس کہ موصوف کا ۳ر نومبر ۱۹۸۵ء کو حیدر آباد میں انتقال ہو گیا) ورنہ ایک حقیقت پر افسانہ کا پردہ پڑا رہتا۔ ہماری استدعا پر موصوف نے انکشاف کیا کہ صفی مرحوم کے لئے لڑکی کی تلاش اور اُس لڑکی سے صفی کے والد کا عقد ایک حقیقت ہے۔ لیکن اس لڑکی سے صفی مرحوم کے عشق و محبت کی داستان بالکل من گھڑت اور بہتان تراشی ہے۔ عشق و عاشقی تو کجا اس لڑکی کو صفی مرحوم نے پہلے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ صرف اس وقت دیکھا جب وہ اُن کی ماں بن کر گھر میں آئیں ہم نے جناب خالدی سے یہ پوچھنے کی جرأت کی کہ آپ کی اِس بات کی صداقت کا ماخذ کیا ہے تو

جناب خالدی نے پُر اعتماد لہجہ میں فرمایا کہ خود حضرت اماں (والدۂ صفیؔ) نے اس حقیقتِ حال سے انہیں واقف کرایا تھا!

صفیؔ کا اپنے گھر سے فرار:۔

صفیؔ ایک حساس دل رکھتے تھے۔ جب اُن کے والد نے دوسری شادی کرلی اور اُس لڑکی سے جس سے صفیؔ کی نسبت چل رہی تھی تو وہ اس سے فطرتاً ضرور متاثر ہوئے ہوں گے مگر دوسری خاص بات یہ کہ وہ ہزار آشفتہ مزاج وغیرہ وغیرہ سہی لیکن ان میں بڑی شائستگی تھی۔ بڑے بزرگوں کے پاس و لحاظ کا خاص جذبہ دل میں رکھتے تھے۔ والد کی شادی کے بعد انہوں نے گوارا نہ کیا ایک جوان لڑکی کی موجودگی میں جوان کی ماں بن گئی ہے اپنے گھر میں رہیں۔ اس لئے انہوں نے فوراً ہی گھر سے راہ فرار اختیار کی۔

صفیؔ گھر چھوڑنے کے بعد:۔ گھر چھوڑنے کے بعد مدرسہ نظامیہ میں قیام و طعام کی سہولت نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس طرح مدرسہ نظامیہ میں رہ کر تعلیم حاصل کرنے کا انہیں موقع مل گیا معلوم نہیں۔ تعلیم کا سلسلہ کب تک رہا مگر یہ یقین ہے کہ بغیر سند لئے انہوں نے مدرسہ کو خیرباد کہا۔ حیدرآباد میں کوئی اُن کا رشتہ دار نہ تھا جو کچھ تھے ان کے دوست اور شاگرد ہی ان کے لئے سب کچھ تھے اسی لئے زیادہ قیام ان کا دوستوں اور شاگردوں کے ہاں رہا اور آخر کار مسجد چوک ایک مدت تک اُن کی قیام گاہ بنی رہی۔ جناب خالدی فرماتے ہیں کہ موصوف کی ابتدائی طالب علمی کا زمانہ مسجد چوک میں گذرا۔ لکھنا، پڑھنا اور سونا مسجد چوک میں رہتا تھا۔ اس مسجد چوک کے کتاب خانہ میں حضرت صفیؔ سے ان کی ملاقات ۱۹۲۶ء (انیس سو چھبیس) میں ہوئی جو بعد کو خلوص و محبت کے رشتوں میں تبدیل ہوگئی۔

صفیؔ کے والد کی بیماری:۔ صفیؔ کے والد دوسری شادی کے چند ماہ بعد مستعد پورہ کے مکان کا تخلیہ کرکے دوسرا مکان محلہ رکاب گنج روبرو ہائی کورٹ متصل "مسجد نوہ" کرایہ سے لے کر وہاں منتقل ہوگئے۔ اس مکان کے دیوان خانہ میں

صفی کے والد کا مطب تھا۔ کویلو کا مکان نا ایں دم" مسجد نور" سے متصل بجانب جنوب ہنوز موجود ہے۔ لیکن ایک سال بھی نہ گذرا کہ مرضِ فالج کا ان پر حملہ ہوا اور وہ اس قابل نہ رہے کہ اپنا مطب جاری رکھ سکیں۔ لے دے کے گھر کی معیشت کا دار ومدار ان کی طبابت پر ہی تھا۔ کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری ذریعہ معاش پر اثر انداز ہوگئی اور وہ پریشانیوں میں گھر گئے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بیماری کے زمانے میں نواب افسر جنگ اور دوسرے امراء نے جو حکیم صاحب کو جانتے تھے ان کی ہمدردی اور مدد کی۔

والد کی خدمت گذاری اور تیمارداری:۔ صفی کو اپنے والد کا حال معلوم ہوا تو وہ بے چین ہو گئے اور فوراً ان کی خدمت کے لئے گھر پہنچ گئے۔ وہ بڑی دل سوزی اور تن دہی سے اپنے والد کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں" والد کی ناتندرستی سے بے آرام ہوں"۔ یہ زمانہ اُن پر بڑا سخت تھا۔ والد کی گذر بسر کا ذریعہ منقطع ہو چکا تھا۔ خود صفی کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ دوست احباب اور شاگردوں سے تھوڑی بہت مدد ہو جاتی تھی مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ اِن حالات میں ضرورتہً وہ اپنی غزلیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دیتے تھے۔ لوگ آتے تھے اور غزلیں، سہرے، نظمیں اور تاریخیں وغیرہ معمولی قیمت پر اپنے نام سے لکھا کر لے جاتے تھے۔ جناب خالدی اِس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے یہ سب کہا۔ وہ اکثر صفی سے ملنے ان کے مکان رکاب گنج جایا کرتے تھے۔

والد کی بیماری، مصائب اور معاشی پریشانیوں نے اِس درجہ مجبور کیا کہ صفی نسبتاً کم کرایہ کا ایک مکان سوق میر کی کمان (دودھ باولی) میں کرایہ پر حاصل کر کے اپنے بیمار والد اور علاتی والدہ سمیت وہاں منتقل ہو گئے (متذکرہ مکان 20-2-860 متصل مسجد سوق میر ابھی تک باقی ہے۔ آخر چند مہینے یہاں رہنے کے بعد اس مکان سے بھی کم کرایہ کے ایک مکان میں جو متصل کمان ساجدہ بیگم مغل پورہ بجانبِ شمال واقع تھا۔

اپنے بیمار والد اور والدہ کو لے کر مقیم ہو گئے۔ صفی کے اس وقت کا اندازہ اپنی کیفیت کی اس چٹھی سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے اپنے دوست حکیم عبدالقادر کو لکھی تھی۔ چٹھی کے آخر میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاعر ہوں، بس جان لیجئے کہ مفلس ہوں، آوارہ ہوں خانگی علاج کراؤں تو روز ۲ روپے بارہ آنے کی ٹپس کہاں سے بھگتوں۔ عنایت کا نہیں رحم کا امیدوار ہوں"

والد کا انتقال:۔ تقریباً تین سال سے کچھ زیادہ مرضِ فالج میں مبتلا اور صاحب فراش رہنے کے بعد کمان، ماجدہ بیگم والے مکان میں صفی کے والد کا ۱۳۴۶ھ میں انتقال ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے اور پھر فالج کی بیماری اور ناموافق معاشی پریشانیوں سے ان کی صحت بڑی طرح بگڑ گئی تھی۔ ان کی تدفین دائرہ حضرت میر مومنؒ سلطان شاہی میں ہوئی۔ اپنے والد کا چہلم صفی نے اس مکان میں خاص اہتمام سے کیا تھا۔ جناب خالدی صاحب اور صفی کے ایک قدیم نیازمند سید عمر مرحوم سے میں نے اس چہلم کا حال سنا۔

صفی کے والد کے بارے میں:۔ جناب خالدی نے نہ صرف صفی کے والد کو دیکھا بلکہ ان کے ساتھ گھر میں رہنے کا موقع بھی ملا تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک اچھے حکیم تھے۔ ان کی شخصیت معتبر اور مقدس تھی۔ پابند صوم و صلاۃ تھے۔ وظائف بھی پڑھا کرتے تھے۔ سفید گرد داڑھی اور مونچھیں کٹی ہوئی رکھتے تھے۔ رنگت گوری تھی وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اپنا دیوان بھی مرتب کیا تھا۔

والد کے انتقال کے وقت صفی کی عمر:۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد چند مہینے صفی ساجدہ بیگم کی کمان والے مکان میں فروکش رہے۔ اس دوران درد گردہ اور دوسرے عوارض میں مبتلا ہوئے۔ اس وقت وہ حکیم عبدالقادر مددگار مہتمم یونانی دواخانہ تالاب میر جملہ کے زیر علاج تھے اپنی بیماری کی کیفیت کی چٹھیاں ذریعہ جناب خالدی بھجواتے تھے جن میں مختلف تواریخ میں ۱۳۴۶ھ

درج ہے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کے والد کا انتقال بھی اسی سنہ میں ہوا۔ صفیؔ کی پیدائش سنہ ۱۳۱۰ھ کے حساب سے والد کے انتقال کے وقت ان کی عمر ۳۶ سال تھی۔

صفیؔ کا آخری مسکونہ مکان:۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جس مکان میں صفیؔ کے والد کا انتقال ہوا۔ اس میں وہ مزید چند مہینے فروکش رہے۔ پھر ایک چھوٹا سا مکان مغل پورہ روبرو خواجہ کا چلّہ گلی میں جناب قادری عبدالرحیم صاحب سے پانچ روپیہ کرایہ پر حاصل کیا اور اپنی والدہ "حضرت اماں" کے ساتھ وہاں منتقل ہوگئے صفیؔ اس مکان میں ستائیس سال (۱۳۴۶ھ تا ۱۳۷۳ھ) تک رہے۔ اگرچہ انہوں نے دواخانہ عثمانیہ میں اپنی زندگی کی آخری سانس لی لیکن ان کا جنازہ اسی مکان سے اٹھا۔ ان کے دُنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد "حضرت اماں" مزید چار سال اس مکان میں رہیں۔

صفیؔ اپنی علاتی والدہ کو "حضرت اماں" کے نام سے مخاطب فرماتے تھے اور شائد اسی وجہ ان کے سب شاگرد اور احباب بھی ان کو "حضرت اماں" ہی کہتے تھے۔

تعلیم

صفیؔ نے ابتداء میں کس کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا، کس سے ابتدائی تعلیم پائی؟ اس پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ ابتدائی حالاتِ زندگی کی یہی باتیں سامنے آتی ہیں کہ وہ بچپن سے بے پرواہ اور لاابالی تھے۔ والد کی طبی مصروفیت اور والدہ کے لاڈ پیار نے انہیں تعلیم و تربیت سے بے نیاز بنا دیا اور پھر والدہ کا انتقال اور والد کے عقدِ ثانی کے کچھ ایسے حادثات گذرے کہ انہوں نے گھر ہی چھوڑ دیا۔ شاعری کا فطری ذوق تھا۔ سِنِ شعور سے شعر کہتے تھے۔ علم کا شوق بھی تھا۔ گھر چھوڑنے کے بعد کھانے کے انتظام اور تعلیم کے شوق کی تکمیل کسی اور جگہ ممکن نہ تھی۔

مدرسہ نظامیہ میں طلبہ کے قیام و طعام کا مفت انتظام تھا اور اُس وقت وہ حیدرآباد کا مشہور تعلیمی ادارہ تھا اِس لئے وہاں شریک ہوگئے مدرسہ نظامیہ میں کتنے دن رہے اور کہاں تک تعلیم پائی کوئی نہیں جانتا۔ اُن کے جاننے والے صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ منشی تک ادھوری تعلیم پائی اور کوئی سند حاصل نہ کرسکے۔ انہوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "منشی نہیں مولوی نہیں"۔ وجہ اُن کی بے چین طبیعت اور شوریدہ سری تھی مکتبِ عشق میں بیٹھنے والے درسِ کُتب میں کہاں تک دِل اٹکاتے۔ وہاں تو دوسرا ہی درس ہوتا ہے ؎

کچھ نہ سیکھو سِکھا دیا دِل نے
سبق اُلٹا پڑھا دیا دِل نے ۔۔۔۔۔ مومن

مدرسہ نظامیہ چھوڑنے کے بعد ان کا قیام دوستوں کے ہاں رہا۔ اور پھر مسجد چوک میں رہنے لگے۔ اُس زمانہ میں مسجد چوک میں ایک اچھا اور بڑا کتاب خانہ تھا۔ جس کے بانی جناب غلام محمد صاحب تھے جنہیں لوگ معتمد انجمن احترامِ اوراق متبرکہ کی حیثیت سے جانتے تھے۔ غلام محمد صاحب سے صفی کی خاص دوستی ہوگئی تھی۔ مطالعہ کتب کے شوق میں تحصیل علم اور حصول فن کے مراحل آسانی سے طئے ہوئے فطری ذہانت اور خدا داد صلاحیت خُدا کی بڑی دین تھی اس لئے حصولِ علم میں کسی اُستاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کی بجائے خود ہی اکتساب علم و فن ذریعہ کُتب بینی کیا۔ یہ مشہور ہے کہ لوگ برسوں جس بات کو سیکھتے ہیں انہوں نے دنوں میں حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں بھی جس اُستاد سے شرفِ تلمذ رہا اس کی مدت بھی بہت کم رہی۔ چوک کے کتاب خانہ میں اُنہیں اُردو، فارسی اور عربی کتابوں کے مطالعہ کا موقع مِلا۔ خاص طور سے اُردو اور فارسی کے بیشتر شعراء کے کلام کا بہ نظرِ غائر مُطالعہ کیا اور مستفید ہوئے۔ جناب خالدی فرماتے ہیں کہ بحیثیت ایک طالبِ علم اُردو اور فارسی کی کتابیں درساً صفی مرحوم کے پاس پڑھی تھیں۔

وہ کہتے ہیں کہ صفی مرحوم کی فنی معلومات حیرت انگیز اور انداز افہام و تفہیم بہت دل نشیں اور متاثر کن ہوتا تھا۔ اس لئے وہ صفی کو "مولوی صاحب" سے مخاطب کرتے تھے۔

کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا لیکن خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی کوئی کتاب خرید کر نہیں پڑھی۔ کتاب خانہ کی کتابیں پڑھتے تھے یا دوستوں یا شاگردوں سے مستعار لے کر پڑھتے تھے۔ جو کتاب زیر مطالعہ ہوتی اس پر صاحب کتاب کی اجازت یا خواہش پر حاشیہ آرائی ضرور کرتے چاہے وہ نثر کی کتاب ہو یا نظم کی۔ ان کی معلومات آفریں حاشیہ آرائی اور کلام پر سخنورانہ تنقیدیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عروض و زبان دانی اور ادب و تاریخ پر انہیں کتنا اُستادانہ عبور تھا۔ افسوس عنایت فرما احباب کی مہربانیوں سے یہ تمام قیمتی سرمایہ اب ناپید ہے۔ جناب محترم معین الدین فاروقی صاحب (رہبر فاروقی) نے راقم کو اپنی مطبوعہ تصنیف "تاریخ نامہ جنگ شہید" کا مسودہ دکھایا جس میں شروع سے آخر تک حاشیہ پر صفی کی اصلاحیں اور مشورے درج ہیں۔ جناب رہبر جیسے تاریخ داں محقق نے فرمایا کہ تاریخ پر بھی بڑا حیرت انگیز عبور تھا۔

طب کی تعلیم:۔ صفی کے والد ایک اچھے حکیم تھے اور خود صفی بھی طب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "آبائی پیشہ کے لحاظ سے طبیب ہوں" شاعری کی زبان میں وہ اس بات کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

اے صفی شاعری نہیں معلوم بھائی ہم تو طبیب آدمی ہیں

جناب خالدی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انہوں نے صفی مرحوم کا ایک سفارشی خط بنام حکیم مقصود جنگ دیکھا تھا۔ اس رقعہ میں حکیم مقصود جنگ کو صفی نے اپنا تعارف یہ کہہ کے کرایا تھا کہ وہ اُن کے والد مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی کے شاگرد ہیں۔ جب مدرسہ طبیہ قائم ہوا تو حکیم منصور علی خاں اس کے صدر مدرس تھے۔ صفی نے اپنی شاگردی کا حوالہ دیا ہے تو اس سے واضح ہے کہ

وہ ضرور مدرسہ نظامیہ طبیہ میں بغرض تعلیم شریک رہے تھے۔ جناب پروفیسر سید محمدؒ صاحب مرحوم (ایم۔ اے) نے سب رس کے یادگار صفی نمبر میں لکھا ہے:-

"صفی صاحب کو پہلی بار میں نے اب سے کوئی ۳۵-۳۶ برس پہلے اس زمانے میں دیکھا تھا جب کہ وہ منشی یا منشی عالم کا امتحان کامیاب کر کے طب کی تعلیم پا رہے تھے۔" آگے لکھتے ہیں:-

"مدرسہ نظامیہ اور طب کی تعلیم ختم کرنے کے بعد شاعری کا ایسا مشغلہ اختیار کیا جس نے اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ صفی کی افتادِ طبع نے دل جمعی کے ساتھ کسی فن کے سیکھنے کا موقع نہ دیا۔ اس لئے یقین ہے کہ طب کی تعلیم کی مدت کم رہی اور وہ سند حاصل نہ کر سکے۔ اُن کا آبائی پیشہ طبابت تھا دوسرے یہ کہ فنِ طب سے اُنہیں دلچسپی بھی تھی لیکن اپنی فطری صلاحیت اور ذہانت کی بدولت فنِ طب کے رموز سے کافی آگاہی حاصل ہو گئی تھی۔

ہم پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ اپنے والد کے انتقال کے بعد وہ ساجدہ بیگم کی کمان والے مکان میں چند مہینے مقیم رہے۔ اِس زمانے میں وہ بیمار ہو گئے تھے اور حکیم عبدالقادر کے زیرِ علاج رہے۔ کیفیت کی چٹھیاں حکیم صاحب کے نام ہیں بہ یک نظر اُن کو دیکھ کر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ایک طبیب دوسرے طبیب سے طب کی زبان میں گفتگو کر رہا ہے۔ ایک شخص جو طبی اصطلاحات اور طبی نکات سے تک کما حقہٗ واقف نہ ہو اس کے لئے اِن چٹھیوں کا پڑھنا بس کا روگ نہیں۔ کیفیت کی چٹھیوں سے چند جملے حسب ذیل ہیں:-

"اس گنہگار کو یاد پڑتا ہے کہ کثرتِ ادرار سے گردے لاغر اور ضعیف ہو جاتے ہیں اور اُن کا علاج ان چیزوں سے لکھا ہے جو گردے کو فربہ کریں مگر قبض کا ڈر جان لیتا ہے۔ تو دانی حساب کم و بیش را!

۲- والد کے انتقال کے بعد مجھے فرصت کہاں ملی۔ ایک نہ ایک عذاب میں

گرفتار چلا آرہا ہوں۔ میں نے اُن کے مجربات میں اقسام کے زراقے دیکھے تھے خصوصًا اس وقت ایک ایسے زراقے کی بھی ضرورت ہے۔

۳۔ پیٹ میں قرقر شروع ہوگیا۔ رات بھر ایک گھوڑ دوڑ رہتی ہے میں سمجھتا ہوں یہ نسخہ مُدر کا اثر ہے کیوں کہ سوائے اس میں تخم کاسنی اور خارہ خسک کے سبب نفاخ اور دیر ہضم اور باد آور ہیں۔ اجازت ہو تو صرف خرفہ اور کاسنی پیا کروں۔ وزن تجویز کردیجے۔ مجیب دوا نہیں کھا رہا ہوں۔

۴۔ زراقے اور نطول سے بہت فائدہ ہے۔ شربت اور مدرات پی رہا ہوں۔

۵۔ ٹھیک تین بجے زیتونی اور لعوقِ المتاس کنکنے پانی کے ساتھ کھایا اور سوگیا۔

۶۔ ایک چٹھی میں اپنی کیفیت لکھتے ہوئے بتایا ہے "یہ سب علامات و کیفیات میری پڑھی ہوئی ہیں مگر کُجا علم اور کُجا تجربہ"۔

حکیم صاحب اِن چٹھیوں کو دیکھ کر متاثر ہوتے تھے۔ بارہا تعریفی کلمات چٹھی کی پُشت پر لکھ کر واپس کرتے تھے۔ ایک چٹھی کی پُشت پر حکیم صاحب لکھتے ہیں :- "آپ کی جادو بیانی دیدہ زیب خوش خطی۔ نکات طبی اور بعض بعض خاص استفسارات کو میں اپنے قلم سے ادا نہیں کرسکتا"۔

حکیم صاحب کی تحریر ایک سند ہے کہ صفی نے طب پڑھی تھی اگرچہ کہ انہوں نے باقاعدہ مطب نہیں کھولا تھا لیکن دوستوں اور شاگردوں کی خواہش پر نسخہ تجویز کرتے تھے۔

اِن کے شاگرد جناب یاور علی خنجر عثمان آبادی سے اپنے اُستاد صفی کو خط میں لکھا ہے۔

"آپ کے حسب ہدایت برابر بنٹس روز دوا کا استعمال کیا۔ الحمد اللہ فائدہ رہا۔ اب نام کو بھی نہیں ہے۔ آپ کا بہت شکر گذار ہوں۔ شافی مُطلق آپ کی طبابت کو ترقی دے"۔ جواب میں صفی لکھتے ہیں :- "تدبیر کارگر ہونے کی بہت خوشی ہوئی خدانے آپ کو شفا دی مجھکو سب کچھ دیا"۔

صفی کے نیازمند شاگرد اور میرے عنایت فرما دوست جناب سید عبدالحفیظ صاحب

محفوظ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ موصوف کی اہلیہ بیمار ہوئیں حکیم اور ڈاکٹر کے علاج سے مرض دفع نہیں ہوا اور بیماری نے طول کھینچا۔ موصوف حضرت کی خدمت میں روز حاضر ہوتے تھے۔ جب اُن کی پریشانی کا حال صفیؔ کو معلوم ہوا تو مریضہ کی کیفیت سُنی اور بعد تشخیص دوا تجویز کی۔ جناب محفوظ فرماتے ہیں کہ ایک ماہ صفیؔ کا علاج رہا اور مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غایب ہو گیا۔ ماہ نامہ سب رس (حیدر آباد) یادگار صفیؔ نمبر مارچ و اپریل ۱۹۵۶ء میں بعنوان "حضرت صفیؔ کی خانگی زندگی" ایک مضمون جناب صابر عارف ذکی کا شائع ہوا ہے۔ موصوف کہتے ہیں کہ "شاعر کے علاوہ اچھے طبیب بھی تھے" اکثر لوگ مرحوم سے کھانسی۔ بخار۔ نزلہ وغیرہ کی دوائیں لے جاتے تھے۔ حضرت نے کبھی ان کو مایوس نہیں کیا۔ دوا دیتے اور دوبارہ کیفیت سے مطلع کرنے کی تاکید کرتے تھے۔"

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے یہ ثابت کرنا نہیں کہ وہ ایک حکیم حاذق تھے۔ بقول رفعت مرحوم کہنا یہ ہے کہ "حضرت صفیؔ مرحوم نے اس فن کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔" غرض کہ انہوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، لیکن فطری ذہانت اور غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے اُنہوں نے اس فن کے نکات کو بہت جلد سمجھ لیا تھا۔ بطور پیشہ اس فن کو اختیار نہیں کیا۔ باقاعدہ کہیں مطب کھولا نہ حکمت کی۔ وہ طبی مشورے ضرور دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ کسی اچھے حکیم یا ڈاکٹر سے رجوع ہونے کی رائے بھی دیا کرتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ

شاعری ہو یا طبابت کچھ بھی ہو ایک بھی فن میں صفیؔ کامل نہیں

صفیؔ کی تصویر

"انتخاب کلام صفیؔ اورنگ آبادی" مرتبہ جناب مبارز الدین رفعت میں صفیؔ کی تصویر موجود ہے۔ جناب رفعت کے بہنوائی جناب خالدی نے مجھ سے فرمایا کہ یہ تصویر خود صفیؔ مرحوم نے بطور یادگار انہیں اپنی جانب سے عطا کی تھی۔ چنانچہ تصویر پر صفیؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر اس کی شاہد ہے۔" خاص عزیزی ابوالنصر صاحب خالدی

کے لئے" تصویر کے نیچے دستخط اور سنہ ۱۳۵۱ھ بھی ہے گویا یہ اس زمانے کی تصویر ہے جب صفی کی عمر اکتالیس سال تھی۔ (تاریخ پیدائش سنہ ۱۳۱۰ھ) بھرا بھرا چہرہ۔ چہرے کے گرد ہلکی خشخشی داڑھی اور مونچھ، سر پہ کپڑے کی سفید گول ٹوپی کرتا اور اس پہ صدری صفی کی جتنی تصویریں بھی نظر افروز ہوئیں کم و بیش سب اسی نصف بدن اور اسی ڈھنگ کی ہیں ہاں یہ بات ضرور ہے کہ عمر کے ساتھ چہرے مہرے میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔

حلیہ

تمام مضمون نگار اس پر متفق ہیں کہ جناب صفی کا قد پست نہ تھا۔ متوسط اور میانہ تھا۔ گندمی صاف رنگ بڑی بڑی سرخ ڈورے دار آنکھیں جن سے ذہانت جھانکتی نظر آتی۔ پیشانی کشادہ۔ ابرو بہت گھنے۔ سینہ کشادہ اور سر بڑا تھا۔ دست و پا بلند۔ مونچھیں باریک۔ خشخشی داڑھی ہمیشہ چہرے کا احاطہ کئے ہوئے۔ بس اتنا کہ داڑھی رکھنے کا گمان ہو۔

ماہ نامہ سب رس یادگار صفی نمبر میں جناب صابر عارف صاحب ذکی لکھتے ہیں" مرحوم فرماتے تھے کہ ہم ساتویں مہینے میں پیدا ہوئے اگر پورے نو مہینے میں پیدا ہوتے تو نہیں معلوم اعضا کا کیا حال ہوتا"۔ یہی بات جناب رفعت نے" انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" میں صفی کی زبانی دہرائی ہے۔ چنانچہ ایک شعر میں سر بڑا ہونے کا اعتراف بڑا دلچسپ ہے ؎

صفی کو دوست سمجھایا کئے آخر وہی سمجھے ہوا ناحق بڑا اس عقل کے دشمن کا سر اِتنا

لباس

سادون (نقشی لنگ) بھی بہت پسند تھا۔ جو لباس ہمیشہ پہنا کرتے اور جس کے عادی تھے اور اپنے اسی وضع دارانہ لباس پر طنز بھی کیا ہے ؎

کُرتا ساروں، واسکوٹ، کُلاہ — اے صفی یہ تو کچھ لباس نہیں

گھر پر ہوتے یا کبھی محلّہ میں نکلتے تو کرتہ اور تہمد باندھے ہوتے۔ راقم الحروف کے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ مغل پورہ کی کمان کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا ایک شخص کو دیکھا سر پر کنٹوپ ہے جسم کُرتے سے بے نیاز اور تہمد باندھے آرہا ہے دوکان دار اٹھ اٹھ کر اور راستہ چلنے والے بڑے ادب سے سلام کرتے جاتے ہیں۔ میں نے جانا کہ یہ کوئی مجذوب ہوں گے۔ یہ مجذوب سب کے سلام کا جواب نہایت خندہ پیشانی سے دیتا جاتا ہے اور خیریت پوچھتا جاتا ہے۔ میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں ان صاحب نے بتایا کہ یہ صفی اورنگ آبادی ہیں! ہم نے زندگی میں کیا کیا اُتار چڑھاؤ دیکھے تجربہ و آزمائشوں سے گزر کر عمر کی آخری حد پہ کھڑے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن، مجذوب صفی کا وہ نقشہ ہمیشہ حقیقت اور زندگی کی صداقت بن کر یہ یاد دلاتا رہا کہ انسان کی عزت اس کے کپڑوں میں نہیں، اس کے اعلیٰ صفات اور اس کے فضل و کمال کی رہین منّت ہے۔ ان کا سادا لباس، ان کی طبیعت کی سادگی کا پرتو تھا اور یہی سادگی ان کے رہن سہن کے طور طریقوں میں بھی نمایاں تھی ؎

حضرت صفی کا ظاہر و باطن ہے ایک سا — جو سادگی مزاج میں ہے وہ لباس میں

ان کے نزدیک سادگی کے یہ معنیٰ نہ تھے کہ جو ملے جیسا بھی ملے لباس پہن لیا۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہنتے تھے۔ پھٹے پرانے پیوند لگے کپڑے کبھی نہیں پہنے چاہے گھر میں رہیں یا باہر جب کسی مشاعرے میں یا کسی تقریب میں شرکت فرماتے تو ان کے لباس کی شان ایسی ہوتی کہ دیکھنے والا بول اٹھتا ؎

صفی کا رنگ دیکھو اور پہناوے کو بھی دیکھو — کہ ایسا رند کیسا پارسا معلوم ہوتا ہے!

وہ پارسا تو نہ تھے مگر لباس کی وضع قطع سے شیخ مقطع بن جانے کا گر خوب جانتے تھے ؎

پارسائی صفی کی ہے معلوم — کچھ بھی ہو شکل تو بنالی ہے

جامہ زیبی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے جسکی بدولت برائیوں کی پردہ پوشی ہو جاتی ہے اور ظاہر بین نگاہیں دھوکہ کھا جاتی ہیں۔ اگرچہ "آرائش سرود ستار" کا ذوق نہ تھا لیکن اس بات کے قائل تھے کہ جامہ زیبی بھی ایک آرٹ ہے ؎

جامہ زیبی بھی عجب چیز ہے دنیا میں صفیؔ ایسے ویسے بھی نگاہوں میں کھٹک جاتے ہیں

لباس سے بے پروائی، وضع قطع سے بے نیازی ان کے نزدیک فن کی توہین ہے ؎

اپنے کمال پر ہے اگر ناز اے صفیؔ ظاہر بھی رکھ بقدر ضرورت ذرا درست

عادات واطوار

سلیقہ وصفائی پسندی:۔ صفی کے معنی پاکیزگی اور صفائی کے ہیں صفی نے اپنے تخلص کی ہمیشہ لاج بھی رکھی اپنے کپڑے آپ خود دھو لیتے اور ہمیشہ پاک وصاف رہتے اور پھر خوش سلیقگی ہمیشہ ان کا شعار رہا۔ چھوٹا سا گھر اور چھوٹا سا دیوان خانہ لیکن جو چیز نظر آتی سلیقہ کی منہ بولتی تصویر نظر آتی اور پھر سلیقہ سونے پر سہاگہ۔ دیوان خانہ دھلے ہوئے چاندنی کے فرش سے آراستہ، جو چیز رہتی نہایت قرینے سے جگہ پر موجود۔ کبھی کوئی چیز ادھر کی ادھر نہ ہوئی۔ دیا سلائی کی ڈبی بھی مقررہ جگہ پر ہمیشہ موجود پائی جاتی۔ چھوٹا سا میز دیوان خانہ میں رہتا جس پر لکھنے کا سامان ہوتا۔ عجیب انکی عادت تھی، سگریٹ کی خالی ڈبی پھاڑ کر اس کے سلپ اکٹھا رکھتے اور جو کچھ لکھنا ہوتا اسی پر لکھتے۔ حضرت کے کئی ایسے نوشتے میں نے دیکھے ہیں۔ کسی پر اشعار ہیں کسی پر مختصر تحریر ہے۔ ایسے سلپ بنڈل کی صورت میں میز کی زینت رہتے۔ وقت پر کسی چیز کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے کبھی کتاب خرید کر نہیں پڑھی۔ کتاب خانہ سے لیکر پڑھا یا کسی سے مستعار لی۔ کسی سے کتاب لیتے اگر اس پر گرد پوش (COVER) چڑھا ہوا نہ ہوتا تو اپنی طرف سے چڑھا دیتے اور پھٹے اوراق جوڑتے۔

جناب خالدی نے صفی سے اپنی پہلی ملاقات کا واقعہ یوں سُنایا کہ مسجد چوک کے کتاب خانے میں وہ ایک کتاب کے مُڑے ہوئے اوراق (شکن کاغذ) بھیگے کپڑے سے بڑے سلیقہ کے ساتھ درست کر رہے تھے۔ ایک "صاحب" وہاں بیٹھے ان کی مصروفیت کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب جناب خالدی نے اپنا کام ختم کر لیا تو ان "صاحب" نے جناب خالدی کی سلیقہ مندی کی داد دیتے ہوئے مسکرا کر کہا "اگر تم لڑکی ہوتے تو میں تم سے شادی کر لیتا"۔ بعد کو جناب خالدی کو معلوم ہوا کہ یہ "صاحب" حیدر آباد کے شاعر "صفی اورنگ آبادی" ہیں۔ جناب خالدی فرماتے تھے یہ بات ۱۹۲۶ء کی ہے۔ جب کہ وہ طالب علم تھے۔ وہ دوسروں کی صفائی پسندی اور سلیقہ مندی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور تعریف کرتے تھے اور شاگردوں کو بھی پابند بناتے اگر کسی شاگرد کی ٹوپی یا کپڑے میلے دیکھتے یا جوتا پھٹا ہوا نظر آتا تو اپنی طرف سے پیسے دے کر تاکید کرتے کہ وہ صفائی کر لیں یا جوتا سلا لیں۔

وہ اپنی آمدنی میں سے فی روپیہ ایک پیسہ نکال کر برائے خیرات ڈبیہ میں رکھتے خاص بات یہ کہ خوب دھو کر ڈبیہ میں رکھتے تھے۔ وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ خیرات کے پیسے میلے ہوں۔ صفائی کے بارے میں ان کا ایک شعر ان کی پاکیزگی فکر کا آئینہ دار ہے ؎

آلائشِ زمانہ سے دامن بچا صفیؔ   کتا بھی بیٹھتا ہے جگہ اپنی جھاڑ کے

وقت کی پابندی:- وقت کی پابندی حضرت صفیؔ کا شعار تھا۔ صبح کا وقت گھر کے کام کاج کے لئے وقف تھا۔ خود کام کرتے تھے۔ شاگردوں سے کام نہ لیتے تھے۔ سودا سلف خود بازار سے لاتے۔ گھر کا پانی باہر سے بھرتے وغیرہ۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح صبح کو ہوتی۔ یہ نہیں کہ وقت بے وقت جب آئے اصلاح دی چار یا پنچ بجے کا وقت ان کے ذوق شوق کے لئے مخصوص تھا۔ چند خاص مقررہ مقامات تھے جہاں وہ میکشی کے لئے جایا کرتے۔ وہاں سے نکلتے تو دوستوں کے ہاں بیٹھک رہتی۔

رات دیر گئے وہ گھر لوٹتے۔ نواب معین الدولہ کے ہاں جانا ہوتا تو اوقات میں ضرور فرق آجاتا۔

حیدرآباد کے شاعر جناب ہرمز کو لکھتے ہیں "(۱) میرے ہاں آنے کے لئے وقت کی پابندی کیا کیجئے۔ میں گھر پہ نہوں تو کوئی کاغذ گھر میں دینے کی ضرورت نہیں۔ ہر صبح (۸) سے (۱۰) تک اور شام (۴) سے (۶) تک گھر پہ رہا کرتا ہوں (۲) اگر مخاطبت کے ساتھ استدعائے اصلاح کی نہ جائے گی تو آئندہ اصلاح دی نہ جائے گی۔"

بات کرنے کا انداز:۔ بات شائستگی اور خندہ پیشانی سے کرتے تھے۔ چاہے وہ کسی رتبہ کا ہو۔ امیر ہو یا فقیر حفظِ مراتب کا ہمیشہ خیال رہا۔ بڑوں کا لحاظ اور چھوٹوں سے شفقت کا سلوک کرتے تھے۔ ؎

آدمیت کا یہ تقاضہ ہے — سب سے اخلاق سے ملا کر

صفی کی صحبت کے ہم نشیں کہتے ہیں کہ گفتگو دلچسپ ہوتی تھی۔ باتوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اور حاضر جوابی اور بدیہہ گوئی تو فطرت میں داخل تھی۔ خاص کر بے تکلف دوستوں سے کھل کر باتیں ہوتیں۔ دورانِ گفتگو برمحل شعر اور لطیفہ گوئی سے محفل زعفران زار بنا دیتے۔ لیکن ایسی باتوں کے وہ قائل نہ تھے جس سے آدمی کا دل دکھے ؎

آدمی کی ہو بول چال ایسی — نہ ہو دل پر کسی کے بھاری بات

اس لئے سوچ سمجھ کر احتیاط سے بات کرنا پسند تھا ؎

قابو میں رکھے زبان کو انسان — جو کچھ بولے سمجھ کے بولے

وہ فطرتاً بہت صاف گو بھی تھے۔ باتوں میں بناوٹ یا ریا کاری نہ تھی۔ بری لگے یا بھلی صاف صاف اور بے لاگ رائے کے اظہار میں نہ چوکتے۔ چاہے کوئی مانے یا نہ مانے ؎

نہیں رکھتے ذرا لگی لپٹی — کون مانے صفی تمہاری بات

جلد بازی طبیعت میں بلا کی تھی۔ بات کرتے تو اونچی آواز میں جلد جلد بات کرتے غزل تحت اللفظ سناتے تھے۔ لیکن بلند اور موٹی آواز میں اور پھر جلد جلد داد کا انتظار

کئے بغیر۔ دو دفعہ حضرت کی زبان سے کلام سننے کی سعادت نصیب ہوئی۔ ایک دفعہ ایک مشاعرہ میں دوسری مرتبہ "حیدرآباد ریڈیو" کے مشاعرہ میں۔ کلام میں جتنی نازک بیانی اور شیرینی تھی غزل پڑھنے کا انداز بالکل اس کے خلاف۔ موٹی آواز اور جلد جلد!

جلد بازی سے اکثر کام بگڑ جانے کا احساس تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں "مجھے اپنی جلد بازی سے سینکڑوں خیالوں میں کامیابی نہیں ہوتی ہے"۔ فرماتے ہیں ؎

جلد بازوں نے دیا ترک تعلق کا سبق　　　کام بننے کے بگڑ جاتے ہیں نادانوں سے

نازک مزاجی :- حضرت صفی کی طبیعت میں نازک مزاجی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ ان کی نازک مزاجی کے ڈانڈے خدائے سخن میر تقی میر کی نازک دماغی سے مل جاتے ہیں۔ نازک مزاجی جب اپنی حد سے بڑھتی ہے تو بد دماغی کی سرحد میں قدم پڑتا ہے۔ میر کو اپنی اس کمزوری کا احساس بھی تھا ؎

ہے نام مجلسوں میں مرا میر بد دماغ　　　از بسکہ بد دماغی نے پایا ہے اشتہار

صفی بھی بڑے نازک مزاج تھے۔ خود اپنے آپ کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں ؎

صفی بھی اب گنا جانے لگا نازک مزاجوں میں
نہیں معلوم کیا کرتا اگر ظالم حسیں ہوتا

ان کی بھی نازک دماغی بعض اوقات بد دماغی کی حد کو پہنچ جاتی تھی۔ مغلوب الغضب ہو جاتے۔ اس کمزوری کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا اعتراف کرتے ہیں مگر ناقدری زمانہ کی شکایت کے ساتھ ؎

صفی کے کلام میں خوبی کہاں سے آئیگی　　　بُرے مزاج کا تھا پھر بُرا زمانہ ملا

ذرا سی بات اور ذرا سا طنز بھی طبع نازک پر گراں گزرتا تھا۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ان کے اُستاد بھائی ریاض کے شاگرد رونق کے ہاں مشاعرہ تھا۔ صفی نے ان کی خواہش پر شرکت کا وعدہ کر لیا لیکن کسی وجہ سے شریک مشاعرہ نہ ہو سکے پھر دوسری مرتبہ جب رونق نے مشاعرہ منعقد کیا تو انہوں نے صفی کو مشاعرہ میں شریک ہونے کا دعوت نامہ

لکھتے ہوئے گذشتہ مشاعرہ میں ان کی عدم شرکت کو وعدہ خلافی پر محمول کیا۔ چنانچہ مشاعرہ کے دعوت نامہ میں جناب رونق نے لکھا ....

.... چونکہ حضرت نے گذشتہ مشاعرہ میں شریک ہونے کا وعدہ فرمایا تھا۔ جس کی اطلاع تمام احباب کو کردی گئی مگر تشریف آوری نہ ہونے کی وجہ مجھے سخت ندامت اُٹھانی پڑی۔ اُمید کہ اس مشاعرہ میں جو ۷ ردی ۶لم ف پنجشنبہ ۹ بجے عقب مسجد افضل گنج ہونے والا ہے تشریف فرماکر حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

مصرع "بے پئے کے خمار ہوتا تھا۔

قافیہ: انتظار نیاز مند: رونق تلمذ ریاض

صفی کی نازک مزاجی جناب رونق کے "سخت ندامت اٹھانی پڑی" والے جملے کی متحمل نہ ہوسکی۔ ان کی شان "انا" کو ٹھیس لگی۔ جواباً صفی نے صرف دو جملے لکھ کر میاں رونق کی بات انہیں لوٹادی:۔

مولوی رونق صاحب!

السلام علیکم و علی من لدیکم۔ معاف فرمائیے اور آئندہ انتظار نہ کیا کیجئے تاکہ آپ کو ندامت نہ اُٹھانی پڑے۔ ریاض میاں کو سلام کہیئے۔ فقط

صفی اورنگ آبادی

وہ بڑے زود رنج بھی واقع ہوئے تھے۔ دکن کی زبان میں جسے "جھٹ خفا" کہتے ہیں۔ خلاف مرضی بات ہوتی تو غصہ آجاتا تھا۔ ایسے موقعوں پر ان کا انداز جذباتی ہوجانا۔ بعض وقت فحش گالی بھی بے ساختہ زبان سے نکل جاتی چاہے وہ خلوت ہو یا جلوت۔ میرے دوست سید عبدالحفیظ صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مشاعرہ ادبیات اُردو کی جانب سے جناب ڈاکٹر زورؔ نے اپنے خسر نواب رفعت یار جنگ کے بنگلہ واقع پنجہ گٹہ منعقد کیا تھا جسکی صدارت جناب غلام محمد مرحوم (سابق وزیر فینانس حکومت حیدرآباد و سابق گورنر جنرل پاکستان) نے فرمائی تھی۔ وہ اس دن بمبئی سے حیدرآباد

تشریف لائے تھے اور وزارت فینانس کا قلمدان حاصل کیا تھا۔ صفی مشاعرہ میں مدعو تھے
جو ڈاکٹر زور کے اصرار کا نتیجہ تھا۔ تاریخ مقررہ پر صفی کے ہمراہ جناب حفیظ، جناب تاباں،
عدیل بھی گئے تھے اور غالباً خواجہ شوق بھی ساتھ تھے۔ اپنی باری پر صفی اپنی غزل سنانے لگے۔
چند شعر سنائے ہوں گے کہ کسی شریر منچلے نے بے تکا فقرہ کس دیا۔ بھلا صفی کو
"تاب شنیدن" کہاں تھی ایک موٹی گالی فقرہ باز کو دے کر اسٹیج سے اتر گئے۔
ڈاکٹر زور دوڑے دوڑے آئے بہت منایا مگر وہ کب کسی کے روکے رُکتے فوراً باہر
نکل آئے اور گھر کی راہ لی ؂

سودائیوں کے نعل کا کیا اعتبار ہے　　　　بیٹھے تو بیٹھے اور چلے تو صفی چلے

ان کی افتادِ طبع کے باعث ان کے حالاتِ زندگی کے بعض گوشے تشنہ بیاں رہ گئے
نہ انہوں نے کچھ بتانا پسند کیا نہ کسی کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہوئی۔

خودداری و قناعت پسندی :- یہ ایک حقیقت ہے کہ صفی کا بچپن
ہو کہ جوانی یا آخری عمر کسی دور میں بھی وہ خوش حال نہیں رہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ
وہ خوددار قناعت پسند تھے۔ کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا نہ کہیں ملازمت
کی۔ بزمانہ جوانی والد کی طویل بیماری اور خود کی بیکاری و بیروزگاری اور ذرائع آمدنی
کا نہ ہونا ایسی باتیں تھیں کہ انہیں سخت آزمائش سے گذرنا پڑا۔ اسوقت مایوسی کا
یہ حال تھا ؂

اے صفی جو بے کسی دل پہ بسی ہے آجکل　　　　وقت ایسا تو ہمارے ہوش میں آیا نہیں

جناب خالدی اسوقت کا حال بیان کرتے تھے کہ صفی مرحوم بیمار ہوئے تو دوا
کیلئے ان کے پاس پیسے نہ ہوتے تھے۔ گھر کا خرچ الگ تھا۔ ان حوصلہ شکن حالات کے
باوجود کسی سے کچھ مانگنا ان کی شانِ خودداری کے خلاف تھا۔ ایسے وقت جناب
خالدی نے بچشم خود دیکھا ہے کہ صفی اپنے اشعار کے موتی کوڑیوں کے دام ضرورت مندوں کو
دے ڈالتے تھے۔ یہ شاعری نہیں ایک حقیقت ہے کہ اس وقت کی تنگ حالی کا نقشہ

بالکل ایسا ہی تھا ؎

اے صفیؔ ہم ان کو اب تو خط بھی لکھ سکتے نہیں
آجکل کچھ ہاتھ ہی ایسا ہمارا تنگ ہے

کسی سے وہ کیوں مانگتے جب اللہ کی روزی رسانی پر ایمان تھا ؎

کسی سے التجا تک اے صفیؔ کرنی نہیں پڑتی
مجھے دیتا ہے گھر بیٹھے مرا روزی رساں کیا کیا

ان کا مشہور شعر ہے ؎

آبرو کھو کر کوئی کیا اہل دولت سے ملے
پاؤ روٹی لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

انہوں نے اپنے کہے کو کر دکھایا اور خودداری کی لاج بھی رکھ لی۔ بظاہر یہ بڑی ہی عجیب اور حیرت انگیز بات معلوم ہوتی ہے کہ صفیؔ جیسا قناعت پسند اور خود دار امیر کبیر نواب معین الدولہ کے دربار سے بارہ سال کس طرح وابستہ رہا! ہم نے اپنے مضمون "نواب معین الدولہ اور حضرت صفیؔ اورنگ آبادی" میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ جسکا ماحصل یہ ہے کہ نواب معین الدولہ کا برتاؤ اور سلوک صفیؔ کے ساتھ بڑی عزت اور قدر دانی کا ہوتا تھا اور وہ خودداری اہلِ حاجت کا نباہنا خوب جانتے تھے۔ اسی طرح صفیؔ کے ایک اور قدرداں نواب تراب یار جنگ سعیدؔ بھی تھے اگرچہ کہ وہ ضامن کنتوری کے شاگرد تھے لیکن صفیؔ سے ان کا سلوک آخر تک بڑا عقیدت مندانہ رہا۔

ظاہر ہے صفیؔ ایک انسان تھے ان کی بھی ضرورتیں تھیں لیکن لالچ کا شائبہ تک ان کی پوری زندگی میں نظر نہیں آتا۔ نواب معین الدولہ اور نواب تراب یار جنگ سے انہوں نے کیا مانگا؟ کوئی جائیداد؟ کوئی منصب؟ روپیہ؟ وہ چاہتے تو انہیں کیا کچھ نہیں ملتا لیکن انہوں نے اپنے مقدر پر ہی تکیہ کیا ؎

اب جو بے مانگے کے مل جائے مقدر اپنا　　ہم فقط حوصلۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اِن اُمرا نے بڑی کوششیں کیں اور پیش کش کیا تاکہ صفی فکرِ معاش سے بے فکر ہو جائیں لیکن انہوں نے سب کو مایوس کر دیا۔ کوئی منصب، کوئی جائیداد تو کجا اپنے رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا ذاتی مکان تک نہ رکھا۔ عمر بھر پانچ روپیہ کرایہ کے چھوٹے سے مکان میں زندگی بسر کر دی ؎

کیا پوچھتے ہو آپ مکان اِس غریب کا ۔۔۔ بستر یہاں نصیب نہیں ہے مکان کہاں

انکی اصل ضروریاتِ زندگی دو ہی تھیں، اپنے اور اپنی والدہ حضرت اماں کے لئے۔ اذوقہ حیات اور پھر اپنی مے نوشی کے لئے تھوڑے سے پیسے۔ زیادہ اور شوق ذوق نہ تھا۔ انکی احتیاج محدود تھی ؎

صفی کو ہے سب کچھ خدا کا دیا ۔۔۔ فقط کھانے کپڑے سے محتاج ہے

اتنی ضرورتیں بہت آسانی سے پوری ہو جاتی تھیں اور انہیں کیا چاہیئے تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ "ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسّر ہے"۔

وہ دلِ بے مدعا رکھتے تھے اور یہی ان کی قناعت پسندی کا راز تھا ؎

بخشا ہے بے طلب دلِ بے مُدعا مجھے
یا میرے دینے والے نے سب کچھ دیا مجھے

وہ ہر حال میں راضی بہ رضا تھے اور اللہ کے شکر گذار تھے ؎

شکر ہے دل اس نے دیا ہے اے صفی ۔۔۔ اور نہایت خوش و خرم دیا

صفی نے کبھی اپنی عزتِ نفس کا سودا نہیں کیا اور نہ کبھی دولت و عز و جاہ کی ہوس لے کر کسی حاکمِ وقت، کسی امیر، کسی وزیر کے آستان کی دریوزہ گری کی۔ معتبر ذرائع سے یہ بات سنی کہ جناب ڈاکٹر زور نے شہزادہ معظم جاہ بہادر کی خواہش پر صفی کو سمجھا منا کر ان کو شہزادہ کے دربار میں چلنے راضی کیا تھا۔ چنانچہ وہ اِن کے ساتھ دربار میں گئے۔ شہزادہ نے اِن کی غزل سن کر بہت تعریف کی اور ان سے دربار آنے جانے کی خواہش کی لیکن صفی دو ایک بار سے زیادہ شہزادہ کے دربار میں نہیں گئے

نام سے شائع کی ہے جس میں نواب معظم جاہ بہادر کے دربار کے چشم دید واقعات لکھے ہیں۔ اِس شاہانہ دربار میں عیش و نشاط رقص و سرود اور اعلیٰ سے اعلیٰ قیمتی مشروبات کی فراوانی اور بھر انواع و اقسام کے غذاؤں اور نعمت ہائے گوناگوں کی تعریفوں میں جناب صدق نے پُل باندھے ہیں اسی کے ساتھ درباریوں اور مصاحبوں کی باہمی رقابتوں، بے جا خوشامدوں، چغل خوریوں اور بے ایمانیوں کے وہ وہ نقشے نظر آتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بھلا آزاد منش صفی اپنے آپ کو اس سونے کے پنجرے میں کس طرح بند رکھ سکتے تھے۔ لوگ دربار معظم جاہ میں بار پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے لیکن صفی اس جنت سے واپس لوٹ گئے اور پھر پلٹ کر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ تو بس اتنا چاہتے تھے کہ پاؤ روٹی ملے اور عزت اور سکوں سے ملے۔

وہ اپنی عزت آپ کرنا جانتے تھے اور اگر لوگ ان کی اس خودداری کو غرور کا نام دیں تو یہ سمجھ کا پھیر ہے۔ بڑے دکھے دل سے فرماتے ہیں ؎

بے غرض دُنیا میں جینا بھی ہے بدنامی کا گھر
لوگ مجھ کو یہ سمجھتے ہیں کہ میں مغرور ہوں

بعض مضمون نگاروں نے لکھا ہے کہ صفی کسی امیر کی مدح کی نہ دربار سے وابستہ ہوئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ صفی ایک نیک نفس، انصاف پسند اور شریف الطبع انسان تھے۔ حسنِ سُلوک کا کھلے دِل سے اعتراف کرتے تھے۔

نواب معین الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ ان کی مدح میں کئی اشعار لکھے، کئی قطعات مدحیہ موجود ہیں۔ نواب تراب یار جنگ سعید ان کے بڑے مداح اور قدردان تھے۔ صفی بعض مواقع پر ان کی مدح کرتے ہیں۔ جب وہ تحت مفادِ جاگیرداران مجلس مقننہ کے لئے منتخب ہوئے تو صفی نے ان کی خدمت میں حسبِ ذیل قطعہ پیش کیا ؎

ہے آج مقننہ میں اِس بات کی دھوم — یعنی ہوئے منتخب سعید مخدوم

تیئس ۲۳ میں جو ملے اُن کو چودہ ووٹ — بے شک ہیں مدد پہ ان کی چودہ معصوم

انہوں نے اپنے قدردانوں کی تعریف اور دوستوں کی تقریبوں میں کئی دلچسپ یادگار اشعار لکھے ہیں اور مادہ ہائے تاریخ کمال فن سے نکالا ہے۔ اگر ان کے اِن فرمودات کو یکجا کر کے طبع کریں تو صفیؔ کی قادرالکلامی کا ایک رنگا رنگ گلدستہ ہمارے ہاتھوں میں ہوگا۔

صفیؔ کی خودداری کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ باوجود تنگ حالی کبھی بھی کسی وقت بھی ان کے لب ذلّتِ سوال سے آشنا نہیں ہوئے نہ کبھی ایسا ہوا کہ جو کوئی بھی ان کی مدد کرنا چاہا انہوں نے قبول کر لیا۔ ان کے خاص دوست یا خاص شاگرد کی مدد ہی ان کے لئے قابلِ قبول تھی۔ اس کے علاوہ کسی نے کچھ دیا تو لوٹا دیا۔

میرے دوست جناب احمد اللہ خاں صاحب وظیفہ یاب انسپکٹر آبکاری نے مجھ سے بیان کیا کہ جناب ناصر الدین احمد مہتمم آبکاری گلبرگہ صفیؔ کی شاعری کے بہت مدّاح تھے وہ صفیؔ کے حالات سے واقف تھے۔ انہوں نے صفیؔ کی اس طرح مدد کرنی چاہی کہ ٹانڈور کے مستاجر " صندل بلیا" سے کہا کہ وہ صفیؔ اورنگ آبادی کے نام سو روپیہ منی آرڈر کر دے۔ چنانچہ مُستاجر نے تعمیل حکم میں فوراً سو روپیہ صفیؔ کو ان کے گھر کے پتہ پر منی آرڈر کر دیئے۔ جب منی آرڈر جناب صفیؔ کو ملا تو انہوں نے منی آرڈر رسید پر یہ لکھ کر رقم واپس کر دی کہ وہ رقم بھجوانے والے کو نہیں جانتے لہذا رقم واپس۔ یہ پولس ایکشن (۱۹۴۸ء) کے بعد کا واقعہ ہے۔ جناب احمد اللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ خود انہوں نے صفیؔ کی یہ تحریر دیکھی ہے۔

صفیؔ بھی انسان تھے، ان کی بھی ضرورتیں تھیں اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے بعض باتوں کو گوارا کرنے مجبور تھے۔ وہ مستغنی المزاج اس معنی میں نہ تھے کہ سب سے منہ موڑ کے کنج عزلت میں گوشہ نشین ہو جائیں۔ ایسا سمجھنے والوں سے کس خوبصورتی سے

سوال کرکے جواب طلب کرتے ہیں ؎

مجھ کو کیوں جانتے ہو مستغنی　　نہیں بندہ نہیں! خدا ہوں میں؟

ان کا تو دعویٰ یہ ہے ؎

انساں سے جس کو کوئی غرض ہی نہیں رہے　　ایسا تو آج تک کوئی انسان نہ ہو سکا

صفیؔ کی زندگی شروع سے آخر تک بڑی صبر آزما منزلوں سے گذری ہے۔ لیکن تنگ حالی میں بھی پائے استقلال ہمیشہ ثابت رہا۔ ان کے پاس کچھ نہ تھا اس کے باوجود وہ کبھی بھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ اہلِ دولت و ثروت سے مرعوبیت ان کی شانِ فقر سے منافی تھا ؎

سرکار غریبوں میں بھی ہوتے ہیں بڑے لوگ
ایسے نہ کیا کیجئے تحقیر کسی کی

فقر، استغناء، توکل، خودداری اور خود شناسی کے عنوان پر جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ روایتاً نہیں ہے وہ ان صفات کے حامل اور نمونہ تھے۔ چند شعر دیکھئے کیا پُر اعتماد لب و لہجہ ہے۔ کیا توکل ہے۔

ہم ذلتِ سوال گوارا نہ کر سکے　　اور اُن کے ذہن میں کوئی سائل نہیں رہا

خون رونا ہے اور خوش ہے صفیؔ　　یہ بھی اِک رنگ ہے طبیعت کا

مرے گدا کو دونوں جہاں سے غرض نہیں　　صورت فقیر کی ہے تو دل بادشاہ کا

مشغلے

مشغلے صرف دو ہی تھے، شاعری اور شراب نوشی۔

شاعری:۔ صفیؔ فطری شاعر تھے۔ جب سے ہوش سنبھالا شعر کہتے تھے۔ شاعری کے لئے وقت مقرر نہ تھا۔ جب چاہا کہہ ڈالا، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے شعر کہتے تھے۔ دماغ شعر ڈھلنے کا مشین تھا۔ بس ارادہ کیا اور شعر ڈھلنے لگے۔ بہت پُر گو تھے۔

اے صفی اللہ جانے یہ غزل کیسی رہی منہ میں جو آتا گیا کہتے گئے ہم جوش میں

غزل میں اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ کوئی شعر بھرتی کا نہ ہوتا تھا
شاعری کی ہر صنف میں استادانہ ملکہ اور دسترس تھی، لیکن غزل گوئی کی طرف
طبیعت کا میلان زیادہ تھا جو ان کا مرغوب اور پسندیدہ مشغلہ تھا۔ بہت کم
مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور شدید تقاضوں پر رسالوں کو غزل روانہ کرتے
تھے۔ طبیعت میں جلد بازی تھی۔ شعر کہتے بھی جلد جلد تھے اور پڑھتے بھی جلد جلد تھے۔

شاعری بر بنائے فطری ذوق کرتے تھے۔ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلہ کی خواہش
شعر کہہ کر دوستوں کو سناتے اور اپنا غم غلط کرتے تھے سے

شاعری اپنی صفی خاطر احباب سے ہے اور پھر کچھ یہ شغل شب تنہائی بھی

کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ شاعری سے حاصل کیا ہوا سے

غرق ہے شعر و شاعری میں صفی فائدہ تو نہیں ہے کوڑی کا

گلزار غزل کی آبیاری خونِ دل سے کی۔ غزل تو نکھر گئی لیکن یہ سودا انہیں کتنا
مہنگا پڑا وہی جانیں سے

رنگینیٔ خیال میں ہے خونِ دل صفی میری خزاں ہے اور غزل کی بہار ہے

شراب نوشی:۔ شاعری کی طرح شراب نوشی کا چسکہ بھی پرانا تھا۔
اس کی چاٹ کب سے پڑی معلوم نہیں ان کے واقف کار کہتے ہیں کہ عنفوانِ
شباب ہی سے وہ نشہ کے عادی ہو چکے تھے، یہ شوق عادت بن گیا تھا۔
اور نشہ کرنا آخر عمر تک جاری و باقی رہا۔ یہ کافر جو منہ سے لگی تو پھر نہ چھٹی "کروں کیا
اے صفی عادت بری ہوتی ہے۔ پینے کی"۔
وہ کہتے تھے کہ انہوں نے ہر قسم کا نشہ کیا لیکن زیادہ سیندھی اور شراب
ان کے مرغوب اور پسندیدہ مشروبات تھے۔ یہ بھی ہے کہ سیندھی زیادہ پیتے تھے
اور شراب کا شوق تھا سے

اِتنی شوخی صفیؔ کسی میں کہاں ۔۔۔ رنگ میں رنگ تو شراب کا رنگ

اِن کے پینے کی کوئی حد نہ تھی اور نہ مقدار متعین تھی۔ اپنے نظریہ کی یوں توضیح کی ہے ؎

مئے خوار سے ممکن نہیں مقدار سے پینا ۔۔۔ تاثیر شراب اور ہے تدبیر دوا اور

دن کے وقت دیوان خانہ کی چھوٹی میز پر ایک شیشی میں شراب رہتی تھی۔ وقفہ وقفہ سے پیئے جاتے تھے۔ کوئی نیا آدمی دیکھے تو یہ سمجھے کہ دوا کا خوراک پی رہے ہیں ؎ ایک خوراک صفیؔ ضعف میں ہے اے ساقی

یہ جو شیشوں میں ہے سب اسکو دوا کہتے ہیں

حضرت کا روز کا معمول اور پروگرام یہ تھا کہ غروب آفتاب کے بعد کمپا ونڈ کا رُخ کرتے ؎ شام آئی میرے ساقی جام شراب نکلا

اک آفتاب ڈوبا اک آفتاب نکلا

کمپا ونڈ جاکر وہاں کے قاعدے قانون کی پابندی کرتے۔ وہاں کے جام و مینا تو مٹی کے بنے ہوتے ہیں وہ ان ہی جام سفال کو جام جم سمجھتے تھے۔ فرش زمین پر بیٹھ کر عالم بالا کی سیر کرتے۔ اِن کے دوست اور شاگرد کبھی ان کے ساتھ ہمراہ جاتے تو ان کے ساتھ زمین پر بیٹھتے۔ شاگرد تو مودب بیٹھ جاتے لیکن بے تکلف ہم مشرب دوست ان کے ہم پیالہ ہوتے اسی طرح کبھی شراب خانے کا رُخ کرتے اگر کسی کو صفیؔ سے ملنا ہوتا' ان سے کوئی کام ہوتا وہ ان اوقات میں سیدھے اِن نشست گاہوں پر پہنچ جاتے چاہے وہ کسی مرتبہ کا ہو۔ عالم ہو، فاضل ہو، پروفیسر ہو۔ صفیؔ کی یہ محفل نہایت شائستہ ہوتی تھی علمی ادبی باتیں' سنجیدہ گفتگو اور ہنسی مذاق سب کچھ دائرہ تہذیب میں۔ اگرچہ وہ بلا نوش تھے۔ لیکن کبھی کسی نے کسی وقت لڑکھڑاتے یا بہکتے یا سڑک پر گرتے نہیں دیکھا اگر کسی وقت ہوا بھی تو واردات اتفاقی میں شمار ہے) یہ ان کی بڑی حیرت انگیز اعلیٰ ظرفی تھی ایسے موقعوں پر اپنے آپ کو سنبھال لینے کا فن خوب جانتے تھے ؎

پائے ساقی پہ نہ گر کر ہوا بد نام صفیؔ ۔۔۔ ہائے نادان! کہاں ہوش سنبھالا تو نے

زیادہ سے زیادہ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے اور آنکھیں سُرخ ہو جاتیں ؎

پیشانی پر نہیں پسینہ اپنی قسمت کو رو رہا ہوں

وہ مشاعروں میں حالت نشہ میں جاتے اور غزل سناتے تھے مگر کیا مجال جو ذرا لڑکھڑائے ہوں یا کبھی ناشائستہ یا مضحکہ خیز حرکتیں کی ہوں۔ ذرا سی پی کر بہکنے کو وہ کم ظرفی سمجھتے تھے ؎

ذرا سی بھی پی لی جو کم ظرف نے کہاں کا ادب، پھر کہاں کا لحاظ

آخر زمانے میں سیندھی اور شراب کو ترک کر دیا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ رمضان کے مہینے میں نہ پیتے تھے نہ کوئی نشہ کرتے تھے۔

پینا ان کا ذاتی شوق تھا اور اس شوق کی تکمیل کے لئے کبھی کسی کے زیر بار احسان نہیں ہوئے۔ اپنی جیب سے خرچ کیا، اپنی گرہ سے دام دیا ؎

یہ کیسے چھینٹے ہیں ہم مشربوں کے اے ساقی
کسی کا ان میں سے کچھ پی کے ہوں نہ کچھ کھا کے

حُسن پسندی:۔ حُسن پسندی کی کئی مثالیں فارسی اور اردو شعراء کے حالات زندگی میں ملتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن بزرگوں کی حُسن پسندی صرف تماشۂ حُسن کی حد تک رہی اور ان پاک بینوں کو ہمیشہ خیال صنعتِ صانع ہی رہا۔ آلودہ دامنی سے ان کا دامن پاک ہے۔ لیکن جب حُسن پسندی میں سفلے جذبات اور بوالہوسی کارفرما ہو تو یہ موجب ننگ و ملامت بن جاتی ہے۔

جب میں صفیؔ اورنگ آبادی کے حالات لکھ رہا تھا تو ان کی زندگی کے اس رخ پر جس پر حُسن پسندی کی چھاپ لگی ہوئی ہے کچھ کہتے قلم رک سا گیا اور میں گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل کے چکر میں پڑ گیا۔ لیکن مشہور ادیب اور صحافی جناب قاضی عبدالغفار صاحب کی ایک تحریر نے میری ہمت بندھائی۔ قاضی صاحب رقم طراز ہیں کہ "سوانح نگاری کا حق ادا کرنے کے لئے کسی بھی بڑے آدمی کے نفسیات کے صحیح مطالعہ کی غرض سے اسکی زندگی کے اس رُخ (یعنی عشقِ مجازی) سے آشنا ہونا ضروری ہے کہ اس قسم کے جذباتی ہیجان میں اخلاق و کردار کے

خصوصیات بے محابا ظاہر ہو جایا کرتے ہیں اور ٹھیک اسی حالت میں ہم اس کے اندلہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں جس طرح شراب کی یہ خاصیت مُسلّمہ ہے کہ اس کے نشہ کی حالت میں فطرتِ انسانی کا عیب وصواب۔ بے اختیار بے پردہ ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ابتلائے عشق کی بے اختیار کیفیتوں میں ہم اعلیٰ نفسیات کا صحیح عکس دیکھ لیتے ہیں۔"

قاضی صاحب کے اس حقیقت پسندانہ نظریہ کی روشنی میں یہ کہنا ہے کہ صفی بھی ایک انسان تھے اور ایسے انسان جسکی قسمت میں حُسن پسندی ازل سے لکھی ہوئی تھی لیکن ان کا نظریۂ حُسن پسندی محدود نہ تھا ؎

اسے بھی چاہیں جو پتھر بھی خوبصورت ہو ابھی یوں نہ محدود ہوا ہی دلچسپی

وہ تو ہر شئے کی خوبی کو دیکھ کر بے اختیار ہو جاتے تھے ؎

نہ دے دشمن کے دشمن کو خدا ذوقِ نظر اتنا تڑپ جانے لگا دل اب تو ہر اک شئے کی خوبی پر

جب ان کے ذوقِ نظر کا یہ معیار ہے تو دستِ قدرت کی بنائی ہوئی گوشت پوست کی مورتیوں کو دیکھ کر ان کا دل کیوں نہ مچلے اور انہیں کیوں نہ چاہیں ؎

خدا کی شان ایسے بھی ہوتے ہیں بشر دیکھو نہیں بھرتی طبیعت لاکھ دیکھو عمر بھر دیکھو

اچھی صورت کو دیکھ کر ان کا جذبۂ حُسن پسندی تیز تر ہو جاتا ؎

اے صفی اس کو تو ساری رات دن بھر دیکھتا ایسی صورت دیکھنے ملتی بھی ہے نادان کبھی

مقبول صورتوں کے دیکھنے کا بہانہ بھی کیا خوب ہے ؎

مقبول صورتوں کو بشر دیکھتے رہے آنکھوں کی جوت بڑھتی ہے دیدار سے صفیؔ

جناب خالدی نے مجھے بتایا کہ اپنے زمانے میں صفی مرحوم کو نواب عالم علی خان کے لے پالک نوخیز خوبرو صاحبزادہ قادر علی خاں سے بہت اُنس تھا جو عشق کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ جناب خالدی نے کئی واقعات سنائے اور آخر میں یہ بھی بتایا کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ربط آپس میں بڑھنے لگا اور ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا جو مدتوں دونوں کی ضعیف العمری تک برقرار رہا۔

حُسن کے باب میں ان کی ساری جنون انگیزیاں ان کے ذوقِ نظر کی تسکین تک ہی رہیں۔ حُسن پسندی کا جذبہ شروع سے آخر زمانے تک انہیں اسیرِ دام رکھا اور دو رجحنوں کے

حسین چہرے ہمیشہ انہیں یاد آتے رہے ؎

حسیں اب بھی نظر آتے ہیں یوں تو اے صفی صاحب
مگر دو چار شکلیں خوب تھیں اپنے زمانے میں

دیگر مشاغل

سگریٹ پینا صفی کا بڑا محبوب مشغلہ تھا۔ چار مینار سگریٹ پیتے تھے اور بہت زیادہ پیتے تھے۔ چائے کے بھی بہت شوقین تھے۔ دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ چائے خانہ جایا کرتے تھے۔ مگر یہ سب رات کے پروگرام تھے وہ بہت کم کہیں جاتے البتہ چائے خانہ میں گھنٹوں دوستوں کے ساتھ بیٹھے گپ شپ ہوتی۔ دلچسپ و بے تکلفانہ باتوں کا دور چلتا۔

پان بھی کھاتے تھے۔ گوشت مرغوب غذا تھی۔ کھانے کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ پکوان بہت اچھا جانتے تھے۔ خاص دوستوں کی پارٹیوں میں پکاتے تھے۔

ابتدائی ایام میں موسیقی سے بھی لگاؤ رہا۔ جس طرح حسن کے پرستار تھے اور متاثر ہوتے تھے۔ اسی طرح اچھی آواز بھی ان کے لئے رہزنِ تمکین و ہوش تھی۔

اے صفی جو آج تک دیکھا سنا سب ہیچ ہے — حسن ہے دنیا میں اچھی چیز یا آواز ہے

جناب خالدی مرحوم فرماتے تھے کہ صفی کو ستار سے بھی شوق رہا۔ چنانچہ ایک خط میں دوست کو لکھتے ہیں "کل تھوڑی دیر بیٹھ کر ستار بجایا تھا"۔

دوست احباب:۔ صفی کی زندگی غیر متاہلانہ تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ اس لئے بیوی بچوں کے بکھیڑے نہ تھے صرف ان کی ایک علاتی والدہ "حضرت اماں" تھیں جو گھر میں رہتی تھیں۔ صفی گھر میں اکیلا پن محسوس کرتے تھے اور یہ اکیلا پن ان کو اداس کر دیتا ؎

تنہا ہوں گھر میں اور شبِ انتظار ہے — مجھ کو چراغِ خانہ چراغِ مزار ہے

شاعری دل بہلانے کا ذریعہ تھی۔ دوستوں کی محفل میں اپنا غم غلط کر کے تسکین پاتے ؎

شاعری اپنی صفی خاطرِ احباب سے ہے ــــــ اور پھر کچھ ہے یہ شغل شب تنہائی بھی

انہوں نے لڑکپن میں گھر چھوڑا تھا تو دوستوں کے ہاں رہے اور پھر نہ جانے کہاں کہاں انکی متلون مزاجی اور شوریدہ سری لے گئی ؎

کوچہ گردی کا نہ پایا کچھ علاج ــــــ خاکِ دُنیا کی صفی نے چھان لی

آخر میں وہ مسجدِ چوک میں قیام پذیر ہوئے ؎

خانہ بدوشیوں کا صفی کی شمار کیا ــــــ مسجد میں ہیں کبھی تو کبھی خانقاہ میں

اِن کے دِل بہلنے کا سامان کہیں تھا تو دوستوں کی محفل میں تھا ؎

صفی کو فکر نہیں دین اور دُنیا کی ــــــ اُسے تو آٹھ پہر دوست آشنا ہونا

وہ خود بڑے زِندہ دِل اور یار باش تھے۔ گھر میں لے دے کے ایک حضرت اماں تھیں جن کے آگے وہ بہت مودب رہتے تھے۔ ہنسی مذاق اور بے تکلفانہ باتیں ممکن نہ تھیں۔ جو شاگرد گھر پر اصلاح سخن کی غرض سے آتے تھے وہ صفی کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے مرعوب ہی رہتے تھے دائرہ ادب سے باہر ہونے کی مجال نہ تھی۔ اس لئے گھر کی فضا اور ماحول میں وہ گھٹن سی محسوس کرتے تھے اور گھر سے نکل کر دوستوں سے ملتے تو محسوس کرتے کہ قید سے رہائی پائی ہے ؎

بغیر احباب کے دم بھر کسی دِن دل نہیں بہلا ــــــ رہے ہم گھر میں ایسے جیسے کوئی قید جانے میں

دوست احباب اور شاگرد بھی انہیں اپنی دلچسپیوں اور مشغلوں میں ساتھ رکھتے۔ پتنگوں کے جلسوں اور میلے ٹھیلے میں لے جاتے تھے۔ محمد چاند کا ہراج خانہ جمعرات کا بازار ہر جگہ دوستوں کے ساتھ جاتے ایک خط میں لکھتے ہیں" نواب اُمید نے بلوایا گیا۔ کہنے لگے آج سرد نگر میں نواب معین الدولہ کی پتنگ بازی ہے۔ آپ کے شاگرد رقیق نے مقابلہ کی پارٹی کئے ہیں" خود صفی کو بڑا شوق سیر تماشوں کا تھا۔ ایک خط میں جوہر کو لکھتے ہیں ۔ آج محرم کی بیسویں بدھ کا دن ہے "تاڑبن" کا میلہ تھا جی تو چاہتا تھا کہ میلے کو بھی دیکھوں اور میلے کے دیکھنے والوں کو بھی اب یا تو اپنی گرہ سے کچھ کھاتا کہ دِل کی گرہ کھل جاتی اور تماشہ بینی کا لطف آتا مگر میاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ یا کوئی دوست کرم فرماتا تو گھر بیٹھے

جی بہل جاتا مگر یہ بھی اُس کس کو؟ اِس وقت شام کے چھ بجنے کو ہیں۔ دل بہت دُکھا ہوا ہے۔ بہر حال ہجور ہوں مجبور ہوں اور اپنے مقصد سے دور ہوں" ان کا مقصد کوچہ گردی اور سیر تماشہ تھا تاکہ دل بہل جائے ؎

اُے صفیؔ اس لئے آوارہ پھرا کرتے ہیں — جی بہل جائے کسی جا تو گھڑی بھر اپنا

اپنی ایک رباعی میں اپنی پریشان نظری کا کیا خوب علاج تجویز کیا ہے ؎

میلے ٹھیلے کی جب خبر پاتے ہیں — دش بیش کو گھود کر چلے آتے ہیں
ساری دُنیا تو دِل کو بہلاتی ہے — ہم ہیں کہ صفیؔ نظر کو بہلاتے ہیں

جناب رفعت "انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" میں لکھا ہے کہ "حضرت صفیؔ بڑے کثیر الاحباب تھے۔ اِن میں ہر قسم اور ہر طبقہ کے آدمی تھے۔ عالم، فاضل، جاہل، ان پڑھ صاحبِ ثروت، خوش حال اور مفلس و کنگال فقیر۔ وہ سب سے بڑے انکسار اور تواضع سے ملتے تھے"

جناب رفعت نے اِن کے دوستوں میں ہر طبقہ کے آدمیوں کو شامل کیا ہے۔ انکی تفصیل بھی انہوں نے بتائی ہے لیکن میں ان کے حلقۂ احباب میں پہلوانوں کا اضافہ کرونگا۔ حیدرآباد کے مشہور پہلوان استاد عیسیٰ پہلوان صفیؔ کے بڑے لنگوٹی یار اور ہم نوالہ و ہم پیالہ دوست تھے۔ جب صفیؔ نے مغل پورہ میں سکونت اختیار کی تو ان کا ربط استاد عیسیٰ پہلوان سے قائم ہوا استاد عیسیٰ کے ہاں پنجاب کے پہلوانوں کی آوک جاوک تھی اس لئے صفیؔ سے بھی ان پہلوانوں کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ یہاں خط لکھتے تو ضرور اپنے دوست صفیؔ کو سلام لکھتے۔

وہ دوستوں کے بڑے قدردان تھے۔ خیالِ خاطرِ احباب ہمیشہ رہا ؎

اِنسان کبھی خاطرِ احباب نہ توڑے — جو ایسا کرے گا وہ پشیمان رہے گا

بارِ خاطرِ احباب ہونا پسند نہ تھا ؎

سب کچھ ہوں بارِ خاطرِ احباب تو نہیں — دکھتا ہے ایک رنگ مرا اضطراب خاص

صفیؔ آشفتہ حال آشفتہ دل تھے۔ دوست ان کا کہاں تک ساتھ دیتے اس کا احساس بھی تھا ؎

میرے جگر کی ٹیس کو احباب کیا کریں　　　کانٹا نہیں چبھا ہے کہ کوئی نکال دے

زمانہ کا انقلاب تو ایسا ہے کہ دوست بھی طوطا چشم ہوجاتے ہیں بدل جاتے ہیں انجان ہوجاتے ہیں۔ ایسے دوستوں سے بھی سابقہ پڑا ؂

یاری غرض کی اور نہ مطلب کی دوستی　　　بیٹھے ہیں دیکھ دیکھ کے ہم سب کی دوستی

بعض سے نقصان بھی پہنچا دل شکنی بھی ہوئی ؂

بے درد ایسے کوئی زمانہ نہ پا سکا　　　جن دوستوں کا ذکر مری داستاں میں ہے

دوستوں کی بے دلی کا احساس بھی شدید تھا ؂

کِس کو ملال عشرت اغیار اے صفی　　　دِل کو خیال بے دلی دوستاں ہے اب

مطلبی دوستوں کا بھی تلخ تجربہ ہوا ؂

یاری غرض کی اور ہے مطلب کی دوستی　　　بیٹھے ہیں دیکھ دیکھ کے ہم سب کی دوستی

صفی کی یہ بڑی بلند حوصلگی تھی کہ اپنی بے راہ روی کی تہمت دوستوں پر نہیں لگائی۔ کھلے دل سے اعتراف کیا کہ اپنی تباہی کے وہ خود ذمہ دار ہیں " سعدی از دست خویشتن فریاد " سے انحراف نہیں کیا ؂

سچ تو یہ ہے کہ خود خراب ہوئے　　　دوست ہم کو خراب کیا کرتے

جو دوست دنیا سے رخصت ہوئے ان کو بھولے نہیں، یاد رکھا ؂

اب کہاں وہ دوست، وہ یاران مشرب اے صفی
اٹھ گئے دنیا سے جو تھے ساتھ اکثر بیٹھے...

صفی کے اشعار کا گلزار ہجو کے خارزار سے پاک ہے۔ جن دوستوں نے ان کا دل توڑا جنھوں نے ان کی دل آزاری کی ان کی ہجو میں اپنی زبان کو آلودہ نہ کیا۔ ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا حالانکہ وہ بڑے نازک مزاج تھے اور اگر کوئی بات طبع نازک پر گراں گذرتی تو بدمزاج بھی ہوجاتے تھے۔ ان کی شرافت تو یہ ہے کہ اپنے دشمن کو بھی بدعا نہیں دی نہ بُرا چاہا ؂

ہم سے تو اس کے واسطے بھی بددعا نہ ہو دشمن بُرا سہی مگر اس کا بُرا نہ ہو

دوستوں سے حسنِ سلوک :- جناب صفیؔ دامے اور درمے دوستوں کی مدد کرنے کے موقف میں نہ تھے لیکن سخنے، قدمے، ہمیشہ مستعد رہے۔ ان کے لئے کسی سے التجا کرنا، مدد چاہنا، منت اور خوشامد کرنا ان کی شانِ خودداری کے منافی تھا۔ لیکن دوستوں کی بھلائی اور فایدے کے لئے اپنے اُصولوں کو بالائے طاق رکھا اور کوئی پرواہ نہ کی۔ مناسب سمجھے تو خود جاتے یا پھر سفارشی خط لکھتے۔ دو ایک ایسے سفارشی خط دیکھنے کو ملے :-

"...... لیجئے اب لوگوں کو اس کا بھی یقین ہوتا چلا ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور میری سنتے بھی ہیں اس کے تحت یہ لکھنا پڑا۔"

اسحاق بیگ صاحب (برادر مرسل ہذا) حکیم زچ کنڈہ تعلقہ دیگلور اپنا تبادلہ کسی دوسرے مقام پر چاہتے ہیں۔ چونکہ اس وقت طبیب بھونگیر کا تبادلہ کسی اور مقام پر ہو رہا ہے اس لئے اگر اول الاذکر ان کی جگہ آجائیں تو میں اپنے ایک واجب الاحترام محسن کی نظر میں، زیادہ عزیز ہو جاؤں گا۔ بات تو صرف اس قدر ہے کہ میں نے آپ سے عرض کیا ہے۔ آپ صدر مہتمم طبابت یونانی سے سفارش فرمادیں اور ان کا کام نکل جائے۔

باقی خیریت ۔ فقط

صفی

ایک دوسری چھٹی کے چند جملے :-

...... یہ مقدمہ (درخواست محب الحق قادری) کا ہے۔ اس وقت صرف اتنا ممکن ہے کہ اس معاملہ میں جاؤش بھی بہت ...... کے ساتھ آپ کے پاس سفارش کریں یا خود ہی آپ کے اجلاس پر آجاؤں۔" فقط

صفی

کسی سفارشی چھٹی میں لکھا :-

.... دوسرے یہ کہ یہ صاحب چچا قادر حسین مرحوم کے فرزند ہیں۔ ان کی

کارروائی سررشتہ سے معتمدی میں آچکی ہے۔ دریافت فرمایئے اور بعجلت وہاں سے بعد تکمیل نکلوانے کی کوشش فرمائیں۔ میں منتظر ہوں۔ صفی

ایک بات راقم الحروف نے سنی اور سُنی ان سُنی کردی تھی۔ کیسے معلوم تھا کہ اس بات کا ذکر کرنا پڑیگا۔ ہوا یہ کہ ایک دفعہ میں اپنے تایا نواب عزیز یار جنگ عزیز کے ہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں کسی کا فون آیا۔ نواب عزیز اٹھ کر بات کرنے گئے۔ فون پر کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوئیں بات ختم کرکے بیٹھنے کے بعد کہا کہ صفی صاحب کا فون تھا۔ کسی کی سفارش کی تھی۔ کام بن گیا تو شکریہ ادا کیا ہے۔ پھر نئی شاعری پر بھی ہنسی مذاق رہا مخفی مبادکہ نواب عزیز صفی کے اُستاد بھائی تھے صفی ان کا بہت ادب کرتے تھے اور کبھی کبھی جناب خالدی کے ہمراہ ملنے جایا کرتے۔

نہ جانے اپنے دوستوں سے حُسنِ سُلوک کس کس انداز سے کرتے تھے۔ متذکرہ سفارشی چٹھیوں سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مُلازمت

صفی نے اپنے والد کی زندگی ہی میں گھر چھوڑ دیا تھا۔ کہاں کہاں ان کی زندگی کے دن گذرے۔ اِن پر کیا کیا گذری اور کیا کیا افتاد پڑی وہ جانیں یا خدا جانے۔ طبیعت میں قلندرانہ پن تھا امزاج میں شوریدگی تھی۔ نہ تعلیم مکمل کی نہ کسی فن (طبابت) میں کامل ہوئے ہر وقت بے کار رہتے تھے۔ بس شاعری محبوب مشغلہ تھا اپنی بیکاری کو کس اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے "نکمے آدمی کو فرصت نہیں ہوا کرتی کیونکہ فرصت کام کے بالمقابل ایک شئے کا نام ہے جن کو کام ہوتا ہے انہیں فرصت بھی ہوا کرتی ہے اور جن کو کچھ کام ہی نہیں ہوتا۔ انہیں فرصت ہی نہیں ہوا کرتی۔"

شادی نہیں کی تھی اِس لئے ذمہ داری کا بوجھ گردن پر نہ تھا۔ والد کے انتقال کے بعد اپنی علاتی والدہ (حضرت اماں) کی دیکھ بھال اور خدمت البتہ کرتے رہے اس وقت تک کہ ...

ملازمت نہیں کی تھی۔ موجودہ حالات میں کب تک بغیر ذریعہ معاش زندگی گذارتے۔ ان کی طویل بیکاری اور بیروزگاری، معاشی مصائب اور اس پر طرّہ ان کی خودداری۔ ان حالات میں دوستوں کے شدید تقاضہ پر سرکاری نوکری کے لئے راضی ہوئے۔

صفی کے انتقال کے بعد اخبار سیاست میں مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۵۴ء ایک مضمون جناب تمکین کاظمی صاحب کا بعنوان "ہائے صفی" شائع ہوا تھا۔ جناب تمکین لکھتے ہیں:۔

"ذرا سی پابندی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی مظہر علی کامل اور عمر یافعی صاحب نے مجبور کیا اور صفی کے دوست قادر علی خاں نے اپنا ساتھ دینے کی خواہش کی تو صفی نے دفتر دیوانی و مال میں کام شروع کیا۔ دفتر جاتے جاتے کبھی باغ عام میں بیٹھ جاتے کبھی حسین ساگر کے کٹہڑے پر رہ جاتے۔ اس طرح کبھی برخواست کے وقت دفتر پہنچے اور کبھی کسی تفریح میں دفتر کا وقت ختم ہو جاتا۔ اس طرح نوکری کرنے کی فکر تھی"

"مرقع سخن" ان کی زندگی میں مرتب و شائع ہوا۔ صفی کے حالات میں لکھا ہے کہ انہوں نے محکمہ جات نظم جمعیت سرکار عالی۔ اسپیشل مجسٹریٹی اضلاع دیوانی بلدہ۔ عدالت عالیہ فینانس معتمدی فوج اور آرائش بلدہ میں بدفعات ملازمت کی۔ پھر اس کے بعد پیشکاری میں بھی کام کیا۔ لیکن نوکری کی پابندیاں صفی جیسے لاابالی اور قلندرانہ طبیعت رکھنے والے آدمی کے بس کا روگ نہ تھیں۔ مشکل سے چند مہینے یا ایک سال ملازمت کو نباہا اور پھر دو ہاتھوں سے سلام کیا اور پھر شغل بیکاری تا ختم زندگی آئین حیات بنا رہا ؎

کسی نے جب سے اپنے کام کا ہم کو بنایا ہے ۔۔۔ بڑھاہے شغل بیکاری ہمارے سب مشاغل میں

جناب تمکین کاظمی صاحب نے اپنے متذکرہ مضمون میں جو واقعہ لکھا ہے وہ صفی کے افتاد طبع کی حیرت انگیز مثال ہے فرماتے ہیں :۔ "ان کا وہ لاابالی پن زندگی کے ہر شعبے پر چھایا ہوا رہا۔ تقریباً بیس ۲۰ اکیس ۲۱ سال کی بات ہے کہ چار مینار کے پاس ایک کپڑے کی دوکان پر صبح سویرے صفی بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ سلام علیک کے بعد مجھے روکا اور میرے ساتھ چل کر علی میاں کے ہوٹل میں چائے پینے لگے اس کے بعد میں چلا گیا اور صفی وہیں ٹھہرے رہے۔

ڈھائی تین بجے جب میں لوٹا تو دیکھتا کیا ہوں کہ صفی کے گھر سے جنازہ نکل رہا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صفی کے والد کا جنازہ ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے صبح میں انتقال کی اطلاع کیوں نہیں دی۔ کہنے لگے آپ سے جب ملاقات ہوئی تو میں کفن کے لئے کپڑا خرید رہا تھا۔ پھر ادھر کی باتوں میں جو لگا تو ذکر کرنا بھول گیا۔ یہ رنگ تھا ان کی طبیعت کا!

صفی اورنگ آبادی کا آخری زمانہ

محترم جناب خالدی صاحب فرماتے ہیں کہ ابتدائی زمانے میں صفی مرحوم نہ نماز پڑھتے تھے نہ روزہ رکھتے تھے۔ متبرک راتوں شبِ قدر اور شبِ معراج وغیرہ میں بھی نمازوں کا اہتمام نہ ہوتا۔ البتہ رمضان کے مہینے میں وہ شراب اور دیگر منشیات سے قطعی پرہیز کرتے تھے بلکہ سگریٹ تک نہ پیتے۔

ایک بات جناب خالدی نے بڑی خاص اور عجیب سنائی وہ یہ کہ عید کا دن سب کیلئے خوشیوں کا ہوتا ہے لیکن عیدین میں صفی مرحوم بہت اداس اور افسردہ رہتے تھے۔ اس دن گھر میں بیٹھے روتے رہتے اور پھر گھر سے کہیں چلے جاتے۔ اس کی وجہ جناب خالدی نے نہیں پوچھی۔ جناب صفی کی افتادِ طبیعت ہی ان کے واردات پوچھنے کی مانع رہتی تھی۔ جناب خالدی کے بیان کی تصدیق صفی کے ان اشعار سے ہوتی ہے جن میں عید کی خوشیوں کی بجائے درد والم کے جذبات جھلکتے ہیں ؎

پھرتے ہیں نگاہوں میں مرے عید کے جلسے
جاتی ہے پریشان بنا کر مجھے ہر عید

گھر چھوڑنا پڑتا ہے صفی سال میں دو بار
اے کے بھی مرے واسطے ہے وجہ سفر عید

ہم دوست کو منائے تو دنیا منائے عید
اپنی گذشتہ عید بھی ہے یاد ہائے عید

یہ اشارہ دو کنائوں کی باتیں صرف صفی ہی جانتے تھے مگر یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جوان تھا۔

جناب محمد غلام محبوب خاں صاحب مسلم، حضرت صفی کے آخری دور کے شاگرد ہیں۔ صفی کے انتقال (۱۹۵۴ء) سے تین سال قبل (۱۹۵۱ء) میں بعد وظیفہ ملازمت محمد ابراہیم صاحب

داروغہ خواجہ جلہ کے توسط سے صفی کی خدمت میں بغرض اصلاح حاضرِ خدمت ہوئے رات دن صفی کی صحبت میں اُٹھتے بیٹھتے اور استفادہ کے کافی مواقع ملے۔ اکثر گفتگو شاعری فن عروض اور زبان دانی پر ہوتی تھی۔ یہ سعادت مندی سے ملتے اور صفی کا برتاؤ بھی عزت اور محبت کا ہوتا۔

جناب مسلم صاحب نے صفی کے آخری دور کی بہت سی باتیں بچشم خود دیکھیں اور اپنے اُستاد صفی کی زبانی اپنی برائی بہت کچھ سُنا۔ جناب مسلم کا بیان ہے کہ آخری زمانہ میں حضرت صفی نے شراب پینا ترک فرما دیا تھا۔ البتہ افیون کا استعمال ضرور رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ کثرت مے نوشی کا جو مضر اثر ہونا تھا وہ صفی کی صحت پر ہوا ؎

اب مے کدہ کی خیر ہو یا پیر مے کدہ　　سُنتے ہیں ہو گیا ہے صفی کا جگر خراب

مسجد میں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگے تھے ؎

یہ کیوں رہ رہ کے مسجد کا ارادہ　　صفی کس کو منانا چاہتا ہے

عصر کی نماز البتہ گھر پر ہی ادا کرتے۔ تیمم کے لئے لال مٹی چھنوا کر رکھی تھی۔ کوشش یہی ہوتی کہ نماز باجماعت پڑھیں ؎

صفی خدا سے دعا ہے خدا قبول کرے　　کہ پانچ وقت نماز اپنی باجماعت ہو

رمضان میں روزہ رکھتے اور تراویح کے لئے مکہ مسجد جاتے تھے۔ تراویح کی نماز میں ہمیشہ آخری صف میں سیدھی جانب بیٹھنا ان کا خاص انداز اور معمول تھا۔ متبرک راتوں میں بھی نماز پڑھنے اور عیدین کی نماز کے لئے مکہ مسجد جایا کرتے۔

جناب مسلم فرماتے ہیں کہ آخری زمانہ میں حضرت صفی حضرت سردار بیگ صاحبؒ کے سلسلہ کے ایک بزرگ حضرت منومیاں صاحبؒ کے مرید بھی ہوئے۔ یہ بزرگ مسجد ساجدہ بیگم (مغل پورہ) میں رہتے تھے۔ حضرت صفی جب ان سے ملنے جاتے تو پہلے بیگم کی مسجد (اوبر و مکہ مسجد) جاکر نہا لیتے۔ صفی ان حضرت سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ ایک تصویر منومیاں صاحبؒ کی گھر میں لگی ہوئی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا "صفی نواز" "آقائے صفی"۔

مسلک حنفی تھا. بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے تھے ؎

اس کو سمجھو نہ ڈھیر مٹی کا　　لوگ ہوں جس مزار کے صدقے

عمر کے ساتھ ہر آدمی کے قویٰ میں اضمحلال بڑھتا جاتا ہے. صفی تو شروع ہی سے اپنی صحت سے بے پرواہ تھے۔ زندگی میں بڑی بے ربطی رہی. کئی عوارض لاحق رہے۔ ان کی خودداری نے معاشی مصائب میں اضافہ کر دیا تھا. آنکھوں کی بینائی میں فرق آ گیا ؎

گریۂ خون سے یہاں رخصت بینائی ہے　　اور وہ پوچھتے ہیں آنکھ تری آئی ہے

ساٹھ کی عمر کو پہنچے تو دم چڑھنے لگا ؎

دم کے چڑھنے سے صفی ٹوٹ گیا بیٹھ گیا　　عمر تو ہو گی کوئی ساٹھ کے اندر باہر

پھر انہیں دمہ کا عارضہ ہو گیا اور اس مرض نے تو رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ سب رس یادگار نمبر (مارچ ۱۹۵۶ء) جناب صابر عارف ذکی نے اپنے مضمون "حضرت صفی کی خانگی زندگی" میں صفی کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے جناب ذکی کے والد صاحب کو لکھا تھا. صفی لکھتے ہیں :-

ضیق النفس نے مرے دم پر بنا دی ہے۔ آمد و رفتِ نفس کا حال کوئی مجھ سے پوچھے۔ خدا جانے جو ہر دم گذرتی ہے. گھر کے گھر ہی میں ضروریات کے لئے آنا جانا ایک بڑی منزل طے کرنا ہوتا ہے اور پھر آ کر اپنی جگہ بیٹھنے کے بعد بھی سانس اور پھر اوسان کا درست کرنا آفت پر آفت ہوتا ہے"

آگے لکھتے ہیں :- "خیر اب یہ جھگڑا تو میرے دم ہی کے ساتھ لگ گیا. شاید مروں تو اس بلا سے چھوٹوں" علاج کا سلسلہ جاری تھا لیکن آثار اُمید افزا نہیں تھے۔ انہیں خود اس کا احساس ہو چلا تھا ؎

ایسی ڈائن سے کیا بچو گے صفی　　موت باسٹھ برس سے تاک میں ہے

اور دوسرے سال باسٹھ ۶۲ سے جب ترسٹھ ۶۳ کے ہوئے تو سچ مچ اس ڈائن موت سے نہ بچ سکے۔ ۱۹ مارچ ۱۹۵۴ء معدہ کی آنت پھٹ گئی اور خون کی قے آنے لگی۔ ان کے

معالج ڈاکٹر عبدالصمد کے مشورہ سے دواخانہ عثمانیہ میں شریک کئے گئے۔ لیکن حالت سنبھل نہ سکی۔ ہوش و حواس اچھے ہی تھے۔ زندہ دلی اور بدیہہ گوئی نے ساتھ نہ چھوڑا تھا۔ لیکن ۲۱ مارچ ۱۹۵۴ء حالت غیر ہو گئی سوا چھ بجے صبح اپنے قریبی شاگرد اور دوست صالح مصلی حامی کے سینے پر سر رکھے زندگی کی آخری سانس لی اور سرزمینِ دکن کا یہ بلبلِ خوش نوا گلزار ارم پرواز کر گیا۔ آخری سانس پر ان کا شعر یاد آگیا ؎

یہی پوچھا صفیؔ کے مرنے پر — آخری سانس اس نے لی کیسی

جنازہ دواخانہ سے ان کے گھر لایا گیا۔ انتقال کی خبر بہت جلد شہر میں پھیل گئی۔ دوست احباب شاگرد اور قدرداں گھر پر جمع ہونے لگے۔ نواب تراب یار جنگ سعید صفیؔ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ انہیں معلوم ہوا تو فوراً تشریف لائے۔ میت کو دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا کہ حیدرآباد تو کیا ہندوستان میں انکا جواب نہ تھا۔ پھر کفن دفن کے بارے میں پوچھتے رہے۔

صفیؔ بڑے دل برداشتہ ہو گئے تھے انہوں نے سوچا کہ زندگی میں نہ قدر ہوئی نہ کسی نے پوچھا اب مرنے پر کون پرسہ کو آئے گا ؎

مجھے بھی دیکھنا ہے کون کون آتا ہے پرسہ کو
مرے مرنے سے کچھ پہلے صفِ ماتم بچھا دینا

جناب مسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت صفیؔ کے شاگرد حامی چاہتے تھے کہ تدفین اپنے آبائی قبرستان واقع درگاہ شاہ راجو ؒ مصری گنج میں ہو۔ وہاں دو قبروں کی جگہ فراہم کرنے وہ تیار تھے ایک اور قریبی شاگرد جیب یا لیٰین بغدادی یاسؔ کی خواہش تھی کہ درگاہ یوسفین ؒ میں دفن کیا جائے۔ جناب مسلم کی رائے تھی کہ حضرت منو میاں صاحب ؒ کے صفیؔ معتقد اور مرید تھے اس لئے یہ بہتر ہے کہ وہیں قبر ہو جہاں منو میاں صاحب ؒ کا مزار ہے۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ حضرت منو میاں ؒ کا مزار حضرت سردار بیگ صاحب ؒ کی درگاہ کے قبرستان میں ہے۔ اسوقت کے سجادہ حضرت اچھے میاں صاحب ؒ نے

ان کی قبر کی نشان دہی کی اور وہیں دو قبروں کے لئے جگہ بھی عنایت کی۔

حضرت صفی کا جنازہ دوش بدوش مسجد چوک پہونچا، نمازِ ظہر کے بعد نمازِ جنازہ پڑھی گئی اس کے بعد جنازہ اسی طرح درگاہ حضرت سردار بیگ صاحبؒ واقع بھوئی گوڑہ آیا، مسجد چوک سے درگاہ کا فاصلہ زیادہ ہی ہے۔ بعض احباب کو جنازہ کے ساتھ چلنا گراں گذرتا تھا۔ اُن پر حضرت صفیؔ کا شعر صادق آرہا تھا ؎

لاش بھی بارِ دوش ہے احباب کو صفیؔ گویا میں ایک اب بھی ہوں بھاری ہزار پر

جنازہ پہنچنے تک قبر تیار ہو چکی تھی چنانچہ حضرت صفیؔ کے جسدِ خاکی کو جو سب کے لئے گنجِ گراں مایہ تھا سپردِ لحد کر کے واپس ہوئے۔

سہ شنبہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۴ء صبح آٹھ بجے مسجد چوک میں فاتحہ سیوم تھا جس میں کثیر تعداد احباب و تلامذہ اور صفیؔ کو چاہنے والوں کی شریک تھی۔ صفیؔ نے فرمایا تھا۔

دوستوں سے یہ التجا ہے مری مغفرت کے لئے دُعا کرنا

حیدرآباد کے مشہور ادیب و محقق جناب معین الدین صاحب رہبر نے تاریخ وفات یوں فرمائی تھی۔ "حضرت صفیؔ اورنگ آبادی آسود"

۱۹۵۴ء

آیئے آپ ہم صمیم قلب کے ساتھ ان کی مغفرت کے لئے دُعا کو ہاتھ اٹھائیں اَللّٰھُمَّ اغفر لہٗ وارحمہٗ وادخلہٗ واسکنہٗ فی الجنہ!

صفیؔ اورنگ آبادی کے اُستاد

صفیؔ اورنگ آبادی پر ایک طویل مقالہ "مرقع سخن" جلد اول مطبوعہ ۱۹۳۵ء میں جناب صاحبزادہ میر اشرف علی خاں صاحب (الدین) کا موجود ہے۔ یہ پہلا مقالہ یا مضمون ہے جس میں صفیؔ اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ صاحبزادہ صاحب نے بتایا ہے کہ :-

"اپنے کہے ہوئے پر کسی نہ کسی کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ ایک غزل ضیا گورگانی کو دکھائی۔ اس کے بعد دو غزلیں حکیم ظہور احمد دہلوی کو اور پانچ سات غزلیں عبداولی فروغ کو اور چند غزلیں کیفی کو دکھائیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ سوائے جناب کیفی باقی اساتذہ سخن کے حالاتِ زندگی تذکروں میں موجود نہیں صفی پر لکھنے والوں نے صرف ان کے اساتذہ کے نام لینے کو غنیمت جانا لیکن ان اساتذہ کے حالاتِ زندگی ان کی ادبی اور علمی سرگرمیوں اور اپنے ان اساتذہ سے صفی کے ربط کے بارے میں ان کے مضامین کا دامن خالی نظر آتا ہے۔

ہماری معلومات کا زیادہ تر ماخذ جناب ابو النصر محمد خالدی مرحوم کی ذاتِ گرامی ہے۔ محترم موصوف نے نہ صرف ان اساتذہ کو دیکھا اور سنا بلکہ انہیں بعض اساتذہ کی محفلوں میں صفی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے مواقع بھی ملے۔ یہ راقم الحروف کی خوش قسمتی ہے کہ محترم موصوف سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا اور میں نے اپنی علمی کم مائیگی سے تا بحدِ استعداد اس عنوان پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔

صفی جب سنِ شعور کو پہنچے تو شاعری کی ابتداء کر چکے تھے اپنی ایک تحریر میں وہ خود کہتے ہیں :-

"نہیں معلوم کتنے برس گذر گئے مگر یہ اچھی طرح یاد آتا ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا ہے شعر کہتا ہوں۔"

صفی کے والد حکیم منیر الدین صاحب بھی شاعر تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ صفی نے بعض اپنے قدیم دوستوں کو بتایا کہ ابتداء میں انہوں نے اپنے والد سے اصلاح لی پھر اس کے بعد انہوں نے جن اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی ان میں پہلا نام ضیا گورگانی کا نظر آتا ہے۔

جناب ضیاء کا مختصر تذکرہ صرف دکن کے قدیم اور مشہور تذکرہ "تزکِ محبوبیہ" جلد دوم میں ملتا ہے۔ اگر صاحب تذکرہ نے ان کا حال نہ لکھا ہوتا تو پھر لوگ اتنا ہی

جانتے کہ وہ ایک شاعر تھے اور بس۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تزکِ محبوبیہ کا بیان نقل کردیا جائے۔

جنابِ ضیاؔ دہلوی: — "حافظ مرزا منیر الدین نام ہے۔ آپ شہزادگانِ دلّی سے ہیں۔ محمد اورنگ زیب شہنشاہ عالمگیر سے آپ تک ساتویں پشت ہے۔ آپ شہزادہ کام بخش کی اولاد سے ہیں۔ ۵ ذالحجہ ۱۲۷۶ھ کو آپ تولد ہوئے۔ آپ کا مولد خاص شہر دلی ہے۔ آپ کے والد بزرگوار صاحب عالم شہزادہ مرزا رحیم الدین (العہد نواب ناصر الدولہ) بطریق سیاحت دلی سے بیجاپور تک تشریف لائے تھے۔ مگر آپ نے نووارد حیدرآباد ہوکر یہاں دفتر صدر محاسبی سرکار عالی میں ملازمت اختیار کرلی ہے۔ آپ کو شاعری میں اپنے والد بزرگوار حضرت حیاؔ دہلوی سے تلمذ ہے اور باقی دیگر علوم شاعری کے متعلق آپ نے جلال لکھنوی سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ فارسی تحصیل ہے۔ عربی میں صرف و نحو سے واقف ہیں۔ شاعری میں بیان، بدیع، عروض، رمل، حساب، طب، تفسیر اور فقہ وغیرہ میں پوری دستگاہ ہے۔ فنونِ سپہ گری۔ پھینک علی مدد میں ید طولیٰ ہے اور اعلیٰ درجہ کے تیراک ہیں علاوہ بریں حافظ قرآنِ مجید ہیں۔ متصل کادوان ساہوان کا مکان ہے۔ کتاب "تحقیقات ضیا" قریب طبع ہے۔ کلام اچھا ہے۔"
(تزک محبوبیہ جلد دوم۔ دفتر ہفتم ردیف ض)

تزکِ محبوبیہ کے بیان سے واضح ہے کہ جناب ضیاؔ ایک جامع کمالات شخصیت تھے۔ صاحب تزک محبوبیہ کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب یہ تذکرہ سنہ ۱۳۲۱ھ میں مرتب و شائع ہوا تو اس وقت جناب ضیاؔ حیدرآباد میں موجود تھے اور مؤلف کو جناب ضیاؔ سے شخصی تعارف بھی تھا اور یہ کہ جناب ضیاؔ کی عمر از روئے تاریخ پیدائش (۴۵) سال کی تھی۔ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے۔

جب دلّی لکھنو اور رام پور کی حکومت اور ریاستیں انقلاب کے ہاتھوں دریہ یہ زوال ہوگئیں اور جب سرپرستوں کا سہارا جاتا رہا تو حیدرآباد اہل فن و کمال کا

ملجا و ماویٰ بن گیا۔ جناب ضیا رام پور سے حیدر آباد تشریف لائے اور محلہ کاروان ساہو میں قیام پذیر ہوئے۔ صاحبانِ فن و کمال کی یہاں جس فراغ دلی سے قدر دانی ہوا کرتی تھی، ان کی بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ شاہزادگانِ دلی سے تھے اس لئے عزّت افزائی ان کے شایانِ شان رہی۔ غفرانِ مکان نواب میر محبوب علی خاں نظام ششم کا عہد زرین تھا۔ بادشاہ، وزیر، امیر و فقیر سب ہی شاعری کے دل دادہ اور قدرداں تھے۔ جناب ضیا کی مہاراجہ کشن پرشاد شاد مدارالمہام کے دربار میں رسائی ہوئی اور وہ مہاراجہ کے حُسنِ سُلوک سے بہرہ مند ہوئے۔ دو سو روپیہ وظیفہ مقرر ہوگیا۔ صفی نے جناب خالدی کو بتایا کہ ان کے استاد ضیا کا مہاراجہ شاد کے دربار میں ایک اعزاز تھا۔ بگلوس لگانے سے مستثنیٰ تھے اور مہاراجہ اٹھ کر سر و قدان کا سلام لیتے تھے۔

جناب خالدی نے جناب ضیا کو اپنے لڑکپن میں دیکھا تھا۔ موصوف فرماتے تھے کہ وہ بڑے رکھ رکھاؤ اور وضع داری سے رہتے تھے۔ اپنے مکان کاروان ساہو سے سواری میں نکلتے۔ سر پر پیلے رنگ کی پگڑی اور جسم پر شیروانی ہوتی تھی۔ چہرہ پر داڑھی رکھتے تھے۔

جناب ضیا کا کلام حیدر آباد کے قدیم رسائل دبدبۂ آصفی، صحیفہ، اور پیام محبوبیہ وغیرہ میں چھپتا تھا۔ اس کے علاوہ حیدر آباد کے مشاعروں کے گلدستوں میں بھی ان کا کلام موجود ہے۔ حیدر آباد آنے کے بعد مشاعرہ عرس حضرت فیض میں شریک ہو کر مصرعہ طرح پر اپنی غزل سُناتے تھے چنانچہ گلدستہ فیض کے مختلف پرچوں میں ان کی غزلیں پائی جاتی ہیں۔ ان کا دیوان نظر سے نہیں گذرا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کی طباعت ہوئی بھی ہے یا نہیں۔ البتہ فن عروض پر ایک کتاب تحقیقاتِ ضیا زیرِ طبع ہونے کا ذکر تزکِ محبوبیہ نے کیا ہے۔

ماہ نامہ صحیفہ جناب کیفی حیدر آبادی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا۔

اِس میں تحقیقاتِ ضیا کے اقتباسات شائع ہوتے رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے مرے دوست حسین یافعی کی مہربانی سے جب صحیفہ کے قدیم پرچے دیکھنے کا موقع ملا تو ان میں تحقیقاتِ ضیا کے اقتباسات نظر نواز ہوئے۔

جناب ضیا تخت گاہ دلّی میں پیدا ہوئے تھے اور شاہزادگانِ دلّی سے تھے۔ اِس لئے ان کی شاعری، زبان و بیان کے لحاظ سے بہت مستند ہے۔ اس کے علاوہ فنِ عروض میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ محاورات اور روزمرہ کے استعمال کے علاوہ شعر کی بندش کا خیال خاص طور پر رکھا کرتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جو بات چاہیئے وہ ضیا کے سخن میں ہے　　بندش درست، لطف زباں، شوخیٔ بیاں

اپنے والد حیا کے علاوہ جلال لکھنوی سے کلام پر اصلاح لی۔ جناب نوح ناروی شاگرد داغ دہلوی نگار کے داغ نمبر (۱۹۵۳ء) میں اپنے مضمون "فصیح الملک حضرت داغ دہلوی بعنوان" ممتاز شاگردوں کے نام" لکھتے ہیں:۔

یوں تو شاگردوں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے لیکن ذیل کے شاگرد امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔

اس طرح جناب نوح نے اکسٹھ ممتاز شاگردوں کے نام لکھے ہیں اور ان ممتاز شاگردوں میں "مرزا منیر الدین صاحب ضیا دہلوی مرحوم" کا بھی نام درج ہے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب ضیا استاد داغ کے ایک ممتاز شاگرد تھے اور فن شاعری میں ایک امتیازی مقام رکھتے تھے۔

فارسی کے استاد سخن جناب ترک علی شاہ قلندر نور محلی نے جب شمالی ہند سے حیدرآباد آکر یہاں سکونت اختیار کرلی تو اپنی زندگی کے آخری دور میں بعمر نود[۹۰] سال انہوں نے فارسی زبان میں شعر کہنے والے شعراء میں دو سو تینتیس[۲۳۳] شعراء کا تذکرہ "سخنورانِ چشم دیدہ" کے نام سے مرتب و شائع کیا اور ان شعرا کا مختصراً تعارف کرایا جن کو انہوں نے بہ چشم خود دیکھا اور سنا حضرت ضیا اردو کے شاعر تھے

لیکن جناب ترکی نے فارسی گو شعراء کی مجلس میں جناب ضیاؔ کے علم و فضل اور کمالِ فن کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں جگہ دی اور یہ لکھا کہ:۔

"ہیچ کلام پارسی مرزا بدست نہ رسیدہ لہذا برائے یادگارِ نام والا اش درج تذکرہ کردہ شد"۔

جناب ترکی جیسے اُستادِ سخن کا یہ بیان جناب ضیاؔ کے علم و فضل اور مرتبہ شاعری کو سمجھنے کیلئے کافی ہے۔

بچپن سے صفیؔ لاابالی طبیعت رکھتے تھے۔ کبھی وہ اپنے مکان واقع مستعد پورہ میں رہتے اور کبھی چوک کی مسجد ان کا ٹھکانا ہوتا۔ یہ مقامات کاروانِ سرا ہو کے قریب جہاں ضیاؔ قیام پذیر تھے صفیؔ کا خود نوشتہ بیان ہے کہ ان کی شاعری کی ابتداء ان کے ہوش سنبھالتے ہی ہو چکی تھی۔ اغلب یہی ہے کہ انہوں نے لڑکپن ہی میں جناب ضیاؔ جیسے ماہر فن اُستاد سے فیض یاب و مستفید ہوئے ہونگے۔

فن عروض میں صفیؔ کی مہارت جناب ضیاؔ سے استفادہ کا واضح ثبوت ہے یہ اور بات ہے کہ فطری ذہانت اور شوق تجسس نے بہت جلد انہیں اس فن کا امام بنا دیا۔

مجھے یہ بات ماننے میں تامل ہے کہ صفیؔ نے صرف اپنی ایک غزل پر جناب ضیاؔ سے اصلاح لی۔ خود صفیؔ اپنی ابتدائی دور کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ شعر بہت کہتے تھے اور جلد کہتے تھے۔ یقیناً انہوں نے زیادہ غزلیں جناب ضیاؔ کو دکھائی ہوں گی اور فن شاعری میں بھی خاطر خواہ مستفید ہوئے ہوں گے۔

صفیؔ نے اپنے دو استادوں کا ذکر بڑی عزت اور عقیدت مندی سے کیا ہے۔

صفیؔ حضرات کیفیؔ و ضیاؔ کا سب تصدق ہے   کہیں طرزِ ادا سیکھی کہیں لطفِ زباں پایا

کیا صفیؔ اپنی صرف ایک غزل پر اصلاح لے کر جناب ضیاؔ کو اتنا بڑا مقام دے سکتے تھے کہ اپنی شاعری کو ان کا تصدق سمجھیں۔

جناب ضیاؔ کے حالاتِ زندگی کسی تذکرہ میں نہیں ملتے "تزک محبوبیہ" سے

تھوڑی رہبری ملتی ہے" سخن وران چشم دیدہ" نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کے عہد میں طبع ہوئی۔ اِس تذکرہ پر تاریخ طباعت درج نہیں ہے۔ البتہ جناب ترکی نے لکھا ہے کہ سخنوران چشم دیدہ کے حروف تہجی سے ۱۳۳۳ھ سنہ طباعت نکلتا ہے۔

ارباب کمال کی قدر دانی شاہان آصفیہ کا شعار رہا ہے۔ چنانچہ حضور آصف سابع نے حضرت ضیاؔ کی قدر افزائی فرمائی۔" حیدرآباد کی علمی نیا ضیاں" مولفہ سید منظر علی صاحب صفحہ (۱۰۳) پر یہ انکشاف کیا گیا ہے (۱) صاحب عالم مرزا منیرالدین صاحب ضیاؔ کے نام ایک سو روپیہ کلدار ماہانہ تاحیات اوائل عشرہ ثانی ماہ ذیقعدہ الحرام ۱۳۳۹ھ میں جاری فرمائے گئے۔"

جناب ترکی کے بیان سے واضح ہے کہ اس وقت ضیاؔ بقید حیات تھے لیکن پھر بھی اس کے بعد کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کتنے برس زندہ رہے۔ ابھی حال میں ایک صاحب سے ایک محفل میں میری ملاقات ہوئی اتفاق سے دوران گفتگو انہوں نے بتایا کہ وہ ضیاؔ گورگانی کے شاگرد ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ ضیاؔ قدیم سے اپنے ذاتی مکان کاروان ساہو میں رہتے تھے وہیں ان کا انتقال ہوا اور اُسی محلہ کی ایک مسجد میں انکی قبر بھی ہے۔

جناب ضیاؔ کے چند شعر تبرکاً پیش ہیں: ۔

وہ نہیں آتے خوشی ان کی نہ آئیں	اب خوشامد کرنے سے تو ہم رہے
کیوں ضیاؔ کو ہاتھ سے کھو تے ہو پچھتاؤ گے پھر	وہ برا ہے یا بھلا ہے آدمی ہے کام کا
رہرو ملک عدم ہیں اہل دنیا اے ضیاؔ	کوئی اوّل جا چکا ہے کوئی آخر جائیگا

حکیم مولانا ظہور احمد دہلوی: ــــ جناب ضیاؔ گورگانی کے بعد صفیؔ نے اصلاح کے لئے اپنے کلام کو جس کے آگے پیش کیا وہ حکیم مولانا ظہور احمد دہلوی ہیں۔ موصوف کے حالات کسی بھی تذکرہ میں دستیاب نہیں نہ صرف یہ بلکہ ان کا کلام یا کوئی شعر بھی قدیم رسائل یا گلدستوں میں پایا نہیں جاتا۔ محترم سید محمد صاحب (ایم۔ اے۔ عثمانیہ) اپنے ایک مضمون جو سب رس کے یادگار صفی نمبر (۱۹۵۶ء) میں شائع ہوا ہے لکھا کہ:۔

" حکیم مولانا ظہور احمد صاحب ظہور مدرسہ فوقانیہ مفید الانام کے اُستاد اردو فارسی تھے"

موصوف نے یہ بھی لکھا کہ "حکیم صاحب میرے بھی اُستاد تھے"۔

اِس واضح بیان کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ حکیم صاحب اُردو اور فارسی کے اُستاد تھے اور شاعری میں ان کا تخلص ظہور تھا۔ محترم خالدی صاحب کو حکیم صاحب کی ہم نشینی کا شرف بھی ملا ہے۔ موصوف نے متذکرہ بیان کی تصدیق کی۔ حکیم صاحب کا وطن حیدرآباد نہیں تھا وہ دلی سے یہاں آئے تھے۔ یہ بھی فرمایا کہ اگرچہ حکیم صاحب کا دعویٰ سخن گوئی اور سخن دانی تھا مگر وہ اچھے اور رتبہ کے شاعر نہ تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ صفی مرحوم نے اپنی دو ایک غزل پر جناب ظہور احمدؔ سے اصلاح لی اس کے باوجود جناب خالدی نے صفی کو حکیم ظہور احمد کا مثل اُستاد ادب و لحاظ کرتے دیکھا ہے یہ روش صفی کی شائستگی اور شرافت نفسی کا واضح ثبوت ہے۔ اس حقیقت کو اس واقعہ سے بھی تقویت پہنچتی ہے جسے جناب خالدی نے بیان فرمایا کہ کسی زمانے میں گھوڑوں کی چوک (موجودہ آشا ٹاکیز شاہ علی بنڈہ) میں ایک مشہور کمپاونڈ تھا۔ خاص طور سے کمپاونڈ حیدرآبادی زبان میں اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سیدھی ملتی ہے اور اس کم خرچ بالانشین کے شوقین مثل کلب جمع ہوتے ہیں، اکثر اُستاد و شاگرد یعنی مولانا ظہور احمدؔ اور صفیؔ اس کلب میں شغل مینا و جام سے جی بہلانے یہاں آیا کرتے۔ کبھی کبھار جناب خالدی صاحب بھی صفیؔ کے ہم رکاب اس محفل میں شریک ہوتے اگرچہ کہ وہ کبھی شریک جام ہوئے اور نہ اس کافر کو منھ لگایا۔ صرف اُستاد اور شاگرد ہی کیف و سرور کی منزلیں طے کرتے تھے۔ صفی پینے کے معاملے میں بڑے اعلیٰ ظرف تھے۔ کبھی بہکتے نہ تھے نہ ان سے ناشائستہ حرکتیں سرزد ہوتیں۔ البتہ کبھی کبھی حکیم ظہور احمدؔ کیف و سرور کی منزلوں سے آگے نکل جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر صفی اپنے اُستاد کے ادب و احترام میں کوئی کمی نہ کرتے بلکہ اور مودب بن جاتے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اس جگہ جب محفل رنگ پر آئی ہوئی تھی، صفی نے ایک فارسی شعر سنایا تو حکیم ظہور احمدؔ پر عالم سرمستی میں وجدانی کیفیت

طاری ہو گئی اور وہ "بصد سامانِ رسوائی سر بازار می رقصم" کی تصویر بن گئے۔ یہ بڑا نازک مرحلہ و مقام تھا لیکن صفی کا تماشہ دیدنی تھا کہ ان کی نظریں نیچی تھیں اور وہ پہلے سے زیادہ مودب بنے بیٹھے رہے۔ جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ جناب خالدی کا چشم دید ہے۔

حکیم مولانا ظہور احمد کی خفگی:۔ نواب عالم علی خان کی دیوڑھی واقع پنجی براق (محبوب مہندی) آج بھی بہ حالِ شکستہ باقی ہے۔ اس دیوڑھی کے دیوان خانے میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ دوسرے شعراء کے علاوہ حکیم ظہور احمدؔ مرزا نادر علی برترؔ شریک ہوتے تھے صفی کی جوانی کا زمانہ تھا وہ بھی شریکِ مشاعرہ ہوتے تھے اور ان کے کلام نے انہیں مقبول بنا دیا تھا۔ ہوا یہ کہ صفی کے چاہنے والوں نے حکیم ظہور احمد کو شہ دی کہ صفی آپ کا شاگرد ہے لیکن شعر آپ سے اچھا کہتا ہے۔ ظہور احمد کو طیش آ گیا انھوں نے کہا "وہ لونڈا ہمارے مقابل کیا شعر کہے گا"۔ یار لوگوں کو موقع ہاتھ آیا۔ انھوں نے بات یہاں تک بڑھائی کہ حکیم صاحب شعر گوئی میں مقابلہ کرنے راضی ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ عالم علی خاں کی دیوڑھی میں کاغذ قلم لے کر مقررہ دن اور وقت آ جائیں۔ داغؔ کا دیوان "گلزارِ داغ" کھولیں اور جو غزل سامنے آئے اس غزل کی ردیف و قوافیہ میں فی البدیہہ غزل کہیں اشعار کی تعداد دس بارہ رکھی گئی۔ صفی کو منا پھسلا کر مقابلہ پر راضی کیا۔ مقررہ دن جو شاعر میدان میں اُترے ان میں حکیم ظہور احمد اور صفی کے علاوہ حضرت برترؔ غازی پوری بھی تھے۔ برترؔ کے کئی شاگرد تھے اور وہ اُستادِ سخن تھے۔ جناب کیفیؔ نے ان ہی برترؔ کے بارے میں کہا تھا ؎ "نہیں ہیں حضرت کیفیؔ تو کیا ثاقب ہے برتر ہے"

قصہ کوتاہ یہ کہ تینوں پہلوانِ سخن کاغذ قلم لے کر شریکِ مقابلہ ہوئے صفی نے آدھ گھنٹے میں چوبیس ۲۴ شعر کی غزل لکھ کر کاغذ پر پتھر رکھ دیا اور باہر نکل آئے۔ اس وقت تک حکیم ظہور احمد اور جناب برترؔ صرف سات

آٹھ شعر ہی تصنیف کئے تھے۔ اس واقعہ سے حکیم ظہور احمد کی اُستادی کو دھکا لگا اور وہ اپنے شاگرد صفی سے ناراض ہو گئے (بیگانگی کی اصل وجہ یہی ہے)

اس واقعہ کو صفی نے جناب خالدی کو سنایا اور جناب خالدی نے راقم الحروف سے بیان کیا۔ حکیم ظہور احمد کے متعلق اتنا ہی معلوم ہے کہ وہ اُردو، فارسی کے مدرس تھے اور صفی کے شاعری میں اُستاد۔ اگر صفی کے اُستاد نہ ہوتے تو وہ پردۂ گمنامی میں روپوش رہتے۔ کیونکہ تمام تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ کب انکا انتقال ہوا اور کہاں تدفین عمل میں آئی۔

جناب عبدالولی فروغ :- شاعری میں صفی کے تیسرے اُستاد فروغ ہیں۔ جناب عبدالولی فروغ کے حالات بدقسمتی سے کسی تذکرہ میں نہیں ملتے۔ ہماری معلومات محدود ہیں لیکن جو کچھ بھی آگاہی ہوئی ہے اس کا ماحصل یہ ہے۔

فروغ کا وطن حیدرآباد دکن ہے۔ وہ پہلے بینچی براق (محبوب مہندی) میں رہتے تھے پھر محلہ جیلہ پورہ منتقل ہوئے۔ فروغ نے ابتداء میں حکیم میر نوازش علی لمعہ کو اپنا کلام دکھایا۔ اس کے بعد انہوں نے شمس الحق سجاد علی مکش تھانوی سے رجوع ہو کر کلام پر اصلاح لی اور آخر میں اُستاد داغ کے شاگرد ہوئے۔ ان کا دیوان کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ دیوان کے طبع ہونے یا نہ ہونے کا بھی حال معلوم نہیں، البتہ ان کی غزلیں قدیم رسائل صحیفہ، پیام محبوب وغیرہ میں دستیاب ہو جاتی ہیں وہ حیدرآباد کے مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اس لئے جو گلدستے مشاعروں کے شائع ہوئے ان میں فروغ کا کلام موجود ہے۔ "گلدستہ فیض" میں فروغ کی غزلیں نظر آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرس حضرت فیض کے طرحی مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ خود فروغ کو مشاعرے منعقد کرنے کا شوق تھا۔ چنانچہ ان کے اُستاد بھائی نواب عزیز یار جنگ عزیز نے فروغ کے منعقد کردہ مشاعرہ میں غزل پڑھی تو مقطع فرمایا ؎

مجبور تھے فروغ کے اصرار سے عزیز جانے نہ تھے مشاعرے میں ہم مگر گئے

فروغ کے منعقد کردہ ایک یادگار مشاعرہ کا ذکر مرقع سخن جلد اول صفحہ ۳۶۴ میں ملتا ہے۔ یہ مشاعرہ فروغ نے اپنے اُستاد بھائی کیفی کے انتقال (۱۳۳۸ھ) پر بطور یادگار بمقام خانقاہ چشتیہ مسجد ساجدہ بیگم مغل پورہ منعقد کیا تھا۔ طرح مصرعہ یوں تھا :- "بھائی کیفی کا ان آنکھوں سے الم دیکھتے ہیں"۔ صفی نے اس مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک مرصع کامیاب غزل سنائی جس کا مقطع ہے ؎

اُٹھ گئی ہائے عجب فرد زمانے سے صفی
آدمی حضرت کیفی سے بھی کم دیکھتے ہیں

صفی کی فروغ سے ملاقات ہونے اور پھر شاگرد ہونے کا قصہ جناب خالدی نے سُنایا۔ یہ قصہ خود صفی نے جناب خالدی کو سُنایا تھا۔ راقم الحروف نے ان واقعات کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

حیدر آباد دکن میں صاحب کمالوں کی قدر دانیوں کا شہرہ دور دور تک پہنچا تو ہر فن اور پیشہ کے باکمالوں نے دکن کا رُخ کیا۔ اہل علم و فضل اور شعرا کے علاوہ موسیقی کے اُستاد سازندے قوال وغیرہ سب ہی آنے لگے۔ یہاں تک کہ جب دلی اور لکھنؤ بازار حسن ٹھنڈا ہونے لگا تو صاحب کمالوں کی طرح صاحب جمالوں کی آمد شروع ہو گئی اور اُستاد داغ کو کہنا پڑا ؎

یونہی گر حسینوں کی آمد رہے گی دکن رشک کشمیر و لاہور ہو گا

ان آنے والوں میں اندور کی ایک طوائف ممتاز جان بھی تھی جو مجسمہ حسن بھی تھی اور موسیقی میں بھی اپنا آپ جواب۔ حیدر آباد میں اس کا قیام پیپلہ برج میں تھا ممتاز کے حسن و جوانی اور آواز کے جادو نے یہاں کے نواب زادوں اور حسن پرستوں کو اسیر دام بنا یا۔ اس کی ہنگامہ آرا شخصیت مصر کی قلوپترہ سے یہاں کچھ کم نہ تھی لیکن ان واقعات کو بیان کرنا موضوع سخن کے دائرے

نہیں ہے۔ اس وقت یہ کہنا ہے کہ جناب فروغ بھی ممتاز کے شمع حسن کے پروانے بن کر کوٹھے پر جایا کرتے تھے۔ یہ حسنِ اتفاق کہئیے کہ ممتاز کے شہرہ حسن نے نوجوان صفی کو بھی اپنے کوٹھے پر کھینچ لیا یہیں ان کی ملاقات جناب فروغ سے ہوئی پھر ایک شمع کے دو پروانوں کا جذبۂ رقابت دوستی اور پھر استاد شاگرد کے مرحلہ میں داخل ہوا۔

جب نواب امرا دے ممتاز کے عشق میں عقل و ہوش کھونے لگے اور دولت لٹانے لگے تو امراء نے کوتوال شہر سے کہہ کر ممتاز کو شہر بدر کرادیا۔ اس وقت کے بادشاہ نواب میر محبوب علیخاں کا انتقال سنہ ۱۳۲۹ھ سے ایک سال پہلے ممتاز شہر بدر کردی گئی۔

صفی کی تاریخ پیدائش ۱۳۱۰ھ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہوگی اور یہی عمر فروغ سے شاگرد ہونے کی ہے

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ جناب فروغ نے اپنی ایک غزل بغرض اصلاح استاد داغ کو پیش کی جس کا مطلع تھا ؎

یہی عالم رہا جو فرقت کا بُت بنا لینگے تیری صورت کا

داغ نے اس مطلع پر صاد فرمایا اور بہت تعریف کی۔ گھر آکر جب فروغ نے یہ مطلع اپنے شاگرد صفی کو سنایا تو انہوں نے کہا کہ جہاں استاد کے مقابلہ میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن فروغ کے مجبور کرنے پر صفی نے کہا کہ بُت کو عالم سے کیا واسطہ، پھر اصلاح مطلع پڑھا ؎

یہی نقشہ رہا جو فرقت کا بُت بنا لیں گے تیری صورت کا

جب فروغ نے استاد داغ سے اپنے شاگرد صفی کی شعر میں اصلاح بیان کی تو داغ نے بہت تعریف کی اور کہا کہ اس لونڈے کی حفاظت کرنا۔

ہمیں اس روایت کے یقین کرنے میں تامل ہے اس لئے کہ استاد داغ کا انتقال ۱۳۲۲ھ کو ہوا۔ اس وقت صفی کی عمر صرف بارہ سال کی تھی اور پھر اس عمر میں ان کی ملاقات نہ فروغ سے ہوئی اور نہ وہ ان کے شاگرد ہوئے۔

مزید یہ کہ جناب کیفی نے اپنے رسالہ صحیفہ ۶ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۳ھ (جلد اول نمبر ۲)

میں چند شعراء کے شعر کا انتخاب شائع کیا اور اسی انتخاب میں فروغ کا مذکورہ شعر بغیر تغیر درج ہے ۔ ع : ۔ یہی عالم رہا جو فرقت کا ۔

یہ تو نہیں معلوم کہ صفی نے فروغ کو کتنی غزلیں دکھائیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ فروغ نے اپنی حد تک صفی کے کلام پر بہت کم اصلاح کی گنجائش پائی۔ صفی کے فن شاعری پر مہارت کا فروغ کو اتنا اعتماد تھا کہ اپنے کہ اپنے دو شاگردوں نعیم الدین حافظ اور حامد بن محمد حامد کو پابند کر دیا تھا کہ وہ صفی سے اپنے کلام پر اصلاح لیں۔ فروغ نے صفی کی پُر گوئی اور شاعری میں خداداد صلاحیت کے پیشِ نظر انہیں اپنے اُستاد بھائی کیفی حیدر آبادی کے ہاں لے جاکر ملایا اور صفی کے کلام پر اصلاح دینے کی خواہش کی ۔

جناب فروغ ایک خوش گو اچھے شاعر تھے ۔ شاعری میں اُستادی کا درجہ رکھتے تھے ۔ حیدر آباد میں ان کے کئی شاگرد تھے ۔ ان کا کلام رفتہ ، شستہ اور شاعرانہ خوبیوں سے آراستہ ہے دو شعر تبرکاً پیش ہیں ؎

باغِ عالم میں جدھر دیکھو تماشا میں ہوں	یوں کبھی شہر میں لگا ہے سوئے صحرا میں ہوں
اُس کے مونھ سے یہ نکل جائے کہ تیرا میں ہوں	ایک مدت سے یہی مجھ کو تمنا ہے فروغ

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کب اور کہاں ان کا انتقال ہوا اور ان کی قبر کہاں ہے ۔

سید رضی الدین حسن کیفی : ۔ جناب عبدالولی فروغ کے بعد صفی نے جس اُستادِ سُخن کو اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کیا وہ سید رضی الدین کیفی ہیں ۔ کیفی صفی کے چوتھے اور آخری اُستاد تھے ۔ کیفی کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ " مرقع سخن " جلد اول میں موجود ہے ۔ اس کے علاوہ ادارہ ادبیاتِ اُردو کی جانب سے جناب سید محی الدین قادری زور نے " کیفِ سخن " کے نام سے ایک کتابچہ مرتب کیا ہے جس میں کیفی کی شخصیت اور فن پہ مضامین سپردِ قلم کر کے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔

نام سید رضی الدین حسن رضوی ابوالرضا کنیت اور عرفیت قطب میاں ۔ مولوی سید نظام الدین احمد کے اکلوتے فرزند تھے ۔ ۱۴ شعبان ۱۲۹۷ھ روز جمعہ محلہ مغل پورہ

(حیدرآباد) میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ مشائخ اور خوش حال تھا۔

بلے کیفی کو ساقی حیدری جام مشائخ پیرزادہ ہاشمی ہے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور علوم شرقیہ کے مدرسہ دارالعلوم میں شریک ہو کر فارغ التحصیل ہوئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے پر اور سند یافتہ ہونے کے بعد والد نے اپنے محکمہ جمعیت سرکار عالی میں جہاں وہ منتظم بخشی تھے۔ کیفی کو کسی عہدہ پر مامور کرا دیا۔ کچھ دنوں بعد ان کا تبادلہ محکمہ تعلیمات میں عمل میں آیا۔ لیکن کچھ مدت بعد محکمہ تعلیمات کو خیرباد کہہ دیا اور صدر امین پولس کی حیثیت سے کچھ دن کام کیا۔ جن جن محکموں میں انہوں نے ملازمت کی صرف اپنے والد کی خواہش اور حکم کی بنا پر کی ورنہ فطرتاً وہ آزاد منش اور خوددار طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے آخر ملازمت کی جکڑ بندوں سے اپنے آپ کو آزاد کرا لیا اور بطور آزاد پیشہ صحافت اختیار کیا۔ دو ماہنامے صحیفہ اور جشن عشرت اپنی ادارت میں نکالتے رہے صحیفہ ۱۳۲۳ھ سے جاری ہوا تھا اور تقریباً دو سال بعد ماہنامہ رسالہ صحیفہ اخبار روزانہ میں تبدیل ہو گیا جس کے مدیر مولوی محمد اکبر علی صاحب تھے

دکن کے ایک صاحب دل بزرگ سید شاہ عمر حسینیؒ کے کیفی مرید اور پھر خلیفہ ہو گئے۔

اپنی وضع قطع بالکل درویشانہ بنالی سے

حضرت کیفی سے مل کر دل ہمارا خوش ہوا عاشقانہ ہے طبیعت شکل درویشانہ ہے

کیفی کو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ ہر سال عرس میں شرکت کے لئے اجمیر جایا کرتے تھے ایک مرتبہ اسی طرح عرس میں اجمیر شریف چلے گئے وہاں اچانک طبیعت خراب ہوئی اور ۵ رجب سنہ ۱۳۳۸ھ انتقال ہو گیا۔ درگاہ شریف کے قریب تارہ گڑھ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ (وفات ۱۹۱۹ء - ۱۳۲۹ ف) جب کیفی کا انتقال ہوا تو ان کے والد بقید حیات تھے۔ ان کو اپنے اکلوتے لائق فرزند کے مرنے کا اتنا صدمہ ہوا کہ وہ دل برداشتہ ہو گئے اور اس حادثۂ جان گداز پہ ترکِ وطن کر کے مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور وہاں سنہ ۱۳۵۱ھ ان کا انتقال ہو گیا۔

کیفی کے ایک فرزند اور دو صاحبزادیاں تھیں۔ صاحب زادہ کا نام سید شمس الدین عرف سید پاشاہ تھا۔ وہ شاعر تھے اور علم ان کا تخلص تھا۔

کیفی بڑے پرگو اور خوش فکر شاعر تھے۔ جملہ اصنافِ سخن میں دستگاہ رکھتے تھے۔ ہزاروں غزلیں، رباعیات، قطعہ اور قصائد لکھے اور آخر میں نظم گوئی کی طرف توجہ کی تو دکن کے حالی کہلائے۔ شاعری کا شوق فطرتاً سن شعور سے تھا، اپنے ایک استاد عبدالجلیل نعمانی سے مشورہ سخن کرتے تھے اور انہی کے کہنے سے زخمی تخلص اختیار کیا۔ استاد کل حضرت میر شمس الدین فیض کے بعد سرزمین دکن میں آپ کے شاگرد بساط شاعری کے اہم مہرے تھے۔ ان میں کئی ایک مرتبہ استادی پر فائز تھے۔ اس زمرۂ اساتذہ میں حفیظ الدین یاس کی بڑی شہرت تھی۔ حیدرآباد میں کئی ان کے شاگرد تھے۔ کیفی بھی ان کی خدمت میں مشورہ سخن کے لئے حاضر ہوئے اس وقت حیدرآباد میں اہل زبان اور غیر اہل زبان کی بحث جاری تھی۔ ملکی اور غیر ملکی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ حضرت یاس اس تحریک کے پرزور حامی تھے۔ یاس کے کہنے پر کیفی نے زخمی سے ملکی تخلص اختیار کیا چنانچہ انکا ایک مقطع ہے ؎

وصل کی شب میں ان سے اے ملکی تھا عجب لطف ہاتھ پائی کا

یاس کے بعد شمس الحق سجاد علی میکش تھانوی سے شرفِ تلمذ رہا تو میکش کی مناسبت سے کیفی تخلص رکھا۔ آخر میں وہ استاد داغ کے شاگرد ہوئے۔ داغ کی شاگردی کی مدت صرف ایک سال ہی رہی۔ اس ایک سال کے کم عرصہ میں داغ سے کیفی کے تعلقات بہت مخلصانہ اور گہرے ہو چکے تھے۔ اگرچہ کیفی کے کلام میں یاس اور میکش کا رنگ سخن موجود ہے، لیکن داغ کا اندازِ تغزل کیفی کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔

کیفی ایک اچھے ادیب اور بلند پایہ تنقید نگار بھی تھے۔ رسالہ صحیفہ اور دکن کے دوسرے رسالوں میں جو مضامین اور تنقیدیں انہوں نے لکھی ہیں وہ ان کے بے مثل انشاء پردازی کی شاہد ہیں اہل ذوق کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ کیفی جیسے پرگو شاعر نے اپنا دیوان اپنی زندگی میں مرتب و شائع نہیں کیا۔ نہ ان کے مضامین کا کوئی

مجموعہ چھپ سکا۔ کیفی کے بعد بھی دکن کے اس بلند پایہ سخنور کا کامل دیوان کسی ادبی انجمن نے شائع نہیں کیا۔ بدقسمتی سے کیفی کے شاگردوں نے بھی اپنے اُستاد کے دیوان کو طبع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اب اس کساد بازاری اور بدذوقی کے دور میں کلیاتِ کیفی شائع ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

کیفی کے ارادت مند دوست مولوی محمد عمر یافعی صاحب کلیاتِ کیفی اور دیوانِ صفی مرتب و شائع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کام کی ابتدا بھی کردی تھی لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی ان کے انتقال کے بعد کلیاتِ کیفی اور دیوانِ صفی کے قلمی نسخے دستبُردِ زمانہ سے گُم ہو گئے البتہ جناب یافعی کا ایک مرتب کردہ اور شائع شدہ مجموعہ کلام کیفی "سرمست" کے نام سے اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ جس میں کیفی کی ۱۳۱۷ھ تک کی پچپن منتخب غزلیں مندرج ہیں۔ "سرمست" کے لائق مرتب نے ہر غزل کے آخر میں سنِ تاریخ لکھتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ غزل کس مشاعرہ میں پڑھی تھی یا وہ کس رسالے کی زینت بنی "سرمست" کی غزلیات پر لکھے ہوئے نوٹ سے مزید معلومات میں اضافہ ہوتا ہے کہ کیفی ۱۳۲۵ھ نواب محسن الملک مرحوم کے تعزیت کے جلسہ میں شرکت کے لئے علی گڈھ بھی گئے تھے اور حسرت موہانی نے انہیں اپنا مہمان بنایا تھا اور ایک مشاعرہ جناب کیفی کے خیر مقدم میں کیا تھا۔ کیفی اس مشاعرہ کی غزل کے مطلع میں یوں شکر گذار ہیں ؎

زہے قسمت کہ میں ناخواستہ مہمان حسرت ہوں
الٰہی بے خطا تقصیر وارِ شکر نعمت ہوں

کیفی کی موجودگی کو غنیمت جان کر صاحب عالم مرزا خورشید عالم بہادر گورگانی برادرِ حضرت داغ دہلوی نے اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان کی آمد پر ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ نواب خورشید کی پُرخلوص مہمان نوازی کا اعتراف مشاعرہ کی غزل کے ایک شعر میں کیا ہے ؎

وفورِ ذرہ نوازیٔ حضرتِ خورشید
بتا سفر میں ہوں "دہلی" کے یا ہوں میں گھر میں

"سرمست" کے آخر میں کیفی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزل کا عکس ان کے دستخط اور سن و تاریخ موجود ہے۔

کیفی کے ایک قدر دان محمد سردار علی صاحب نے دو مجموعہ کلام ۱۳۴۵ھ میں کلام کیفی اور نظم کیفی کے نام سے شائع کئے۔ حیات کیفی کے نام سے انہوں نے کتاب لکھی۔ پھر انہوں نے ۱۳۴۶ھ میں کیفی کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزلیات مرتب و شائع کی جو "تصویر افکار" کے نام سے مشہور ہے۔ جو کچھ بھی مجموعہ کلام طبع ہوئے ہیں وہ کیفی جیسے پرگو اُستادِ سخن کے شایان شان نہیں ہیں۔ بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی غنیمت ہے۔

دکن میں کیفی کے کئی شاگرد تھے جن میں مشہور صفی اورنگ آبادی مفتی اشرف علی اشرف ریاض الدین ریاض۔ قادر محی الدین باطن۔ تاج الدین مفید۔ احمد سعید خاور عبدالطاہر طاہر سید یوسف علی راغب۔ یاور علی یاور مشہور ہیں۔ شاگردوں میں سب سے زیادہ شہرت صفی نے پائی تھی۔

تاریخ پیدائش سنہ ۱۳۱۰ھ کے حساب سے صفی جناب کیفی سے عمر میں تیرہ سال چھوٹے تھے۔ صفی اپنے استاد کو بڑے حضرت کہتے تھے۔ کیفی جب اپنے شاگرد صفی کے کلام کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور بڑی ہمت افزائی کرتے تھے۔

کیفی صفی سے بڑا مشفقانہ اور محبت و خلوص کا برتاؤ کرتے تھے۔ صفی کا بھی اپنے اُستاد کیفی سے ملنے کا انداز ادب و احترام اور عقیدت کا ہوتا تھا۔ وہ کیفی کے آگے دو زانو ادب سے بیٹھتے تھے۔ کیفی جب کبھی اجمیر شریف یا کہیں اور سفر کرتے تو اپنے شاگرد صفی کو پابندی سے اور بڑی محبت سے خط لکھا کرتے تھے۔ باہم خط و کتابت رہتی تھی وہ اپنے خط میں صفی کو "عزیزم میاں صفی صاحب" کے القاب سے مخاطب فرماتے تھے اور خط کے پتے پر نام اس طرح لکھتے "عزیزی مولوی حکیم بہبود علی صاحب صفی"۔

یہ تعین کرنا ہے کہ اُستاد کیفی کی خدمت میں صفی کب آئے اور کب تک وابستہ رہے۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جب صفی جناب فروغ کے شاگرد ہوئے تو اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ جناب فروغ سے اصلاح کم رہی ہی۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ شاگردی کی مدت زیادہ سے زیادہ دو سال رہی ہوگی۔ دو سال فروغ کی شاگردی

ہیں رہنے کے بعد صفی ۱۳۲۹ھ میں کیفی کی خدمت میں پہنچے اُس وقت صفی کی عمر بیس ۲۰ سال ہو چکی تھی۔ اُستاد کیفی کا ایک خط اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ یہ خط کیفی نے رجب سنہ ۱۳۳۶ھ صفی کو لکھا ہے (اپنے انتقال سے دو سال قبل)۔ اب یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اس وقت صفی کی عمر چھبیس ۲۶ سال کی تھی اس طرح ۱۳۲۹ھ سے ۱۳۳۸ھ نو سال صفی استاد کیفی سے وابستہ رہے اور جب کیفی دُنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے شاگرد اور جانشین صفی کی عمر صرف اٹھائیس سال تھی۔

یہ بات قرین قیاس نہیں کہ صفی نے اس نو سال کے عرصہ میں کیفی کو صرف اپنی ایک غزل دکھائی۔ یقیناً اُستاد کیفی جیسے ماہر فن شاعر اور باکمال شخصیت سے زیادہ مستفید ہوئے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اشعار میں کیفی کو نہایت ادب و احترام سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اپنی ایک طویل اور مشہور غزل کے مقطع میں بڑے متاثر انداز میں فرماتے ہیں ؎

صفی جب باپ کا اُستاد کا رتبہ برابر ہے
مرے کیا حضرتِ کیفی کہ سایہ اُٹھ گیا سر سے

کیفی اپنے شاگرد صفی کے شعروں پر والہانہ انداز سے داد دے کر ہمت افزائی کرتے تھے۔ چنانچہ صفی کی ایک تحریر میں ایک دلچسپ واقعہ درج ہے۔ اس واقعہ میں کیفی کی سادگی اور زندہ دل شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ صفی لکھتے ہیں :-

" تصور صاحب کے پاس ایک مرتبہ رجب میں مشاعرہ ہوا تھا۔ اُستاد عادت کے موافق حاضر دربار غریب نواز تھے۔ مجھے ارشاد تھا' دیکھو مشاعرہ میں ضرور جانا۔ تصور ہمارا دوست ہے رنجیدہ ہو جائے گا۔ میں گیا اور غزل پڑھی۔ واپس تشریف لائے تو شاہ عالم خاں کے مکان میں میرے ایک سرخ رو مصدرِ اخلاق' خان عالی قدر۔ شفیق، مردم فریب، بیمار چشم دوست کے ساتھ ایک حجرے میں بیٹھے کچھ سفر کی باتیں یا حساب کتاب فرمائے۔ میری آواز سنی۔ اسلام علیکم فرمایا۔ یہ خاص ادا تھی' آپ جب کبھی اپنے

خلوص سے ملنے والوں کے مکان پر قدم رنجہ فرماتے یا کسی .... دوست سے ملنا چاہتے اسلام علیکم ذراسی اونچی آواز میں فرماتے) میں نے تو پہچان ہی لیا خوشی خوشی حجرے کے قریب جاکر اندر آنے کی اجازت چاہی۔ فرمایا "آؤ بھئی یہاں کون ہے" سامنے جاکر آداب بجالایا۔ مصافحہ کیا۔ دوزانو بیٹھ گیا (آپ چھوٹوں کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ اور بڑوں کا سب سے زیادہ ادب کرتے تھے) یہ کمال تھا کہ آدمی کو بے ادب نہ ہونے دیتے اور پھر دنیا بھر کے مشورے۔ ہر صیغے کی گفتگو، ہنسی، چہل، ٹھٹھول دل لگی سب کچھ ہوتی۔ ہنسنے ہنسانے میں تو کمال تھا۔ فرمایا "بھائی یہ مدرسہ نہیں دوستوں کی محفل ہے، یاروں کا چق سیدھے بیٹھو۔ بے تکلف بیٹھو تکلفات ٹھیک نہیں" (ذرا پھر چپ رہ کر) ہاں صفیؔ! مشاعرے میں ضرور گئے ہونگے شعر پڑھے ہوں گے سناؤ" میں نے غزل سنانی شروع کی۔ جب یہ شعر پڑھا ؎

یہ کس مرض کی دوا ہیں بڑی بڑی آنکھیں
ہماری قدر تو تری نظر میں کچھ بھی نہیں

جھوٹے کو مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہو۔ "ہائے" کہہ کر گھٹنوں میں سر رکھکر بڑی دیر تک اسی طرح رہے۔ اس بے ساختہ درد بھری آواز سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے دل دھڑکنے لگا۔ اب مجھے افسوس یہ ہوتا تھا کہ یا اللہ میں نے یہ شعر کیوں سنایا۔ اتنے میں آپ نے سر آہستہ سے اٹھا کر فرمایا "سبحان اللہ صفی سبحان اللہ!"

اس تحریر کے نیچے صفیؔ نے یہ شعر لکھا ؎

خاطر سے دل کی نعل در آتش ہوں اے صفیؔ
حضرت کی جوتیوں کا یہ سارا کمال ہے

کیفیؔ کے انتقال کے بعد ۱۳۳۵ھ میں ان کی یاد میں جناب فروغ نے ایک مشاعرہ کا انتظام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں صفیؔ نے چھتیس ۳۶ شعر کی ایک مرصع غزل سنائی اور مقطع میں استاد کو بڑی حسرت سے یاد کیا ہے ؎

اٹھ گئی ہائے عجب فرو زملنے سے صفیؔ
آدمی حضرت کیفیؔ سے بھی کم دیکھے ہیں

جناب کیفیؔ نے تمام اصناف سخن میں کافی سرمایہ شعری چھوڑا ہے۔ ہم صرف

غزل کے چند شعر پیش کرتے ہیں ؂

خم، سبو، ساغر، صراحی، جام پیمانہ مرا
میرے ساقی جب مرا تو ہے تو میخانہ مرا

وہ خفا ایسے سبب سے ہو جائے
کہیں ایسا غضب نہ ہو جائے

یہی کہتا گیا کیفی عدم کو
غزل پڑھ پڑھ کے ہم کو یاد کرنا

شاگرد

جناب نظیر علی صاحب عدیل شاگرد استاد صفی نے اپنے مضمون "صفی کے شاگرد" مطبوعہ یادگار صفی نمبر ۱۹۵۶ء (سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو) میں صفی کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں بتائی ہے پھر اس کے بعد موصوف کہتے ہیں "قدیم شاگردوں اور قریبی حلقوں سے معلومات حاصل ہوئیں وہ (۴۱۰) شاگردوں تک پہنچی ہے"۔

جناب عدیل نے نواب معین الدولہ کا شمار بھی شاگردان صفی میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ جناب پروفیسر یوسف سرمست نے بھی اپنے مضمون "حضرت صفی اورنگ آبادی" میں اپنے والد جناب تمکین سرمست کے حوالہ سے نواب معین الدولہ کو استاد صفی کا شاگرد بتایا ہے۔ لیکن کسی اور تذکرہ میں اس کا ذکر نہیں۔ دیوان معین میں بھی بہ حیثیت استاد صفی کا نام نہیں ملتا۔ دربار معین سے وابستہ ہونے کے دو ماہ بعد اپنے ایک خط میں صفی لکھتے ہیں "...... مرے ذمہ صرف یہی کام ہے کہ فرمائش پر اپنی غزلیں سنا سنا کر ان کا دل خوش کیا کروں" ہمیں کوئی واضح ثبوت نہ مل سکا۔ جناب مبارز الدین رفعت ایم۔ اے عثمانیہ بھی صفی کے شاگرد نہیں ہیں جیسا کہ جناب عدیل نے بتایا۔ انہوں نے ایک شعر بھی نہیں کہا۔ رفعت گھر کا نام ہے۔

شاگردانِ صفی کے جو نام جناب عدیل نے لکھا حسبِ ذیل ہیں:—

نواب قدرت نواز جنگ قدرت۔ مولانا مظہر علی کامل۔ مولانا ابوالفیض فیاض۔ سعید اختر۔ جہاندار افسر۔ ابن احمد تاب۔ محمد شمس الدین تاباں۔ بہادر علی جوہر۔ غلام علی حاوی۔ عبدالمجید خاں خیالی۔ عبدالرحیم راغب فاروقی۔ رئیس جہاں شاداں۔ خواجہ حسین شریف شوق۔ سجاد علی صافی۔ دلاور علی ضابط۔ احمد عبدالوہاب غنی خالدی۔ غیاث صدیقی۔ شرف الدین قاصد۔ محمود عبدالقدیر قدیر۔ سید عبدالحفیظ محفوظ۔ غلام محبوب خاں مسلم۔ سرفراز علی ناوک۔ صاحبزادہ نظام الدین علی خاں نظمی۔ وقار صدیقی۔ امان اللہ ارشد۔ نظیر علی عدیل۔

اگلے وقتوں میں علم وادب کا چرچا اور شعر وشاعری کا ذوق تھا یقیناً استاد صفی کے شاگردوں کی فہرست طویل ہوگی۔ مزید شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ سید غوث یقین۔ امام علی ندا۔ یاور علی خنجر۔ حامی مصلی۔ فخرالدین علی۔ ندیم مغربی معین الدین یوسفی۔ ارادت جہاندار جاہی۔ حفیظ فضا۔ کشن لال ساقی۔ غلام خواجہ عشرتی۔ خواجہ معین الدین عروضی۔

نواب معین الدولہ اور صفی اورنگ آبادی

سلطنت آصفیہ میں بادشاہ کے بعد امرائے پائیگاہ سب سے زیادہ اعزاز اور بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اقربائے سرکار ہونے کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔ آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خاں خلد مکان کے عہد میں نواب معین الدولہ امیر پائیگاہ تھے اور ریاست کے امرائے عظام میں خاصی شہرت اور مرتبے کے مالک تھے۔ وہ ۱۳۰۸ھ کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے محمد معین الدین خاں نام۔ اعانت جنگ معین الدولہ کے خطابات آصف جاہ سابع نے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ بڑی آن بان اور شان کے امیر تھے۔ نواب ممدوح کا پسندیدہ شوق شکار تھا۔ ایک ماہر شکاری کی حیثیت سے ان کے کئی حیرت انگیز قصے دکن میں زبان زد خاص وعام ہیں۔ اس کے علاوہ شاعری فنون لطیفہ۔ گیمس اور

اسپورٹ سے بھی نواب صاحب کو بے حد دلچسپی تھی۔ فنون اور گیمس کی ترقی
کے لئے وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے اور ہمیشہ تعاون و امداد کرتے تھے۔ ہر سال کرکٹ کے
ٹورنامنٹ منعقد کرتے۔ جسمیں بیرونِ ملک کی ٹیمیں شریک ہوتیں اور ان کے
قیام وطعام کا انتظام نواب صاحب کے ذمے رہتا۔ چنانچہ آج بھی ان کے نام سے
معین الدولہ کرکٹ ٹورنامنٹ کا انعقاد ہر سال حیدرآباد میں عمل میں آتا ہے۔
اس کے علاوہ دکن کے عام پسند شوق پتنگ بازی میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے۔
کرکٹ کی طرح پتنگ بازی کے ٹورنامنٹ بھی ان کی سرپرستی میں ہوتے تھے۔
شاعر بھی تھے اور معینؔ تخلص تھا۔ اپنے دربار کے ایک مصاحب مولوی لیاقت علی
صاحب سیفؔ سے ابتداء میں مشورہ سخن کیا۔ اس کے بعد حضرت جلیلؔ کو بھی کلام دکھایا۔
اپنی زندگی میں اپنا دیوان "معین سخن" کے نام سے مرتب وشائع کیا۔ ان کی غزلیں عاشقانہ
مضامین، رندی وسرستی کے علاوہ سادگی و پرکاری کا مرقع ہیں۔

نواب معین الدولہ سے صفیؔ کی واقفیت :- جناب لیاقت علی سیفؔ کے
بعد ان کے دو فرزند میر بہادر علی جوہرؔ اور میر یاور علی خنجرؔ پائیگاہ میں ملازم ہوئے۔
انہیں نواب صاحب کی پیشی میں ہمہ وقت باریاب رہنے کا شرف بھی حاصل تھا۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ صفیؔ کی شاعری حیدرآباد میں مشہور اور مقبول ہو چکی تھی۔ نواب معین الدولہ
صفیؔ کی غزلیں گانے والوں کی زبان سے سن کر متاثر تھے اور ان سے ملنے کے مشتاق تھے۔
خنجرؔ اور جوہرؔ دونوں صفیؔ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بارہا صفیؔ کو معین الدولہ کے ہاں
چلنے آمادہ کرنا چاہا لیکن صفیؔ کی قلندرانہ طبیعت کے آگے کچھ نہ چلی۔

صفیؔ اور کشن لعل :- صفیؔ کی کتاب زندگی کا ایک ورق سادہ رہ جائے گا
اگر ہم کشن لعل کا ذکر نہ کریں۔ تفصیل میں گئے بغیر ہم اتنا کہنے کی جرأت کریں گے کہ
ایک وقت خدائے سخن میر تقی میرؔ کو ایسا وقت آیا کہ انہوں نے صاف صاف

اپنے جذبات کا اظہار کر دیا ۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ایسا ہی کچھ سابقہ صفیؔ کو موتی لعل کلال کے قبول صورت لڑکے کشن لعل سے پڑا۔ شراب کی دوکان دبیر پورہ ریلوے گیٹ کے قریب تھی، شغل مے نوشی اور ایک گونہ بے خودی کے لئے اپنی دوا لینے صفیؔ کشن لعل کی اس دوکان کو جایا کرتے تھے کشن لعل، صفیؔ کا بہت احترام کرتا تھا اور ان کی نشست کا خاص اہتمام اور انتظام کرتا تھا۔ اس لئے صفیؔ کشن لعل کے حُسن صورت کے ساتھ حُسن سیرت سے بھی متاثر تھے اور ازراہِ تفننِ طبع اسے "ساقی" کا خطاب دے رکھا تھا ۔

ایک خوراک صفیؔ ضعف میں ہے اے ساقی   یہ جو شیشوں میں ہے سب اس کو دوا کہتے ہیں

کشن لعل کی دوکان پر جن اصحاب کو صفیؔ کے ہمراہ جانے کا موقع ملا ہے ان کا بیان ہے کہ کئی برجستہ غزلیں اسی دوکان کی نشستوں میں ہوئیں۔ غزلیں لکھ لکھ کر صفیؔ کشن لعل کو دے دیا کرتے تھے۔ اس لئے کشن لعل کو گانے کا بہت شوق تھا اور وہ صفیؔ کی غزلیں بہت عمدگی سے گاتا تھا۔ کشن لعل کا ایک گراموفون ریکارڈ حیدرآباد میں جن لوگوں نے سُنا ہے ان کو اچھی طرح یاد ہوگا۔ صفیؔ کی جو غزل کشن لعل نے گائی اس کا مشہور مطلع ہے ۔

محبت میں کیا کیا مزے داریاں ہیں   کبھی دشمنوں کی بھی غم خواریاں ہیں

کشن لعل، نواب معین الدولہ کے شعبہ ارباب نشاط سے وابستہ اور ان کا ملازم تھا۔ نواب صاحب کو کشن لعل کا گانا بہت پسند تھا۔ وہ صفیؔ کی غزلیں اپنی دلکش آواز میں سُناتا تو معین الدولہ صفیؔ کے حُسنِ کلام سے متاثر ہوتے تھے۔ اور دکن کے اُستادِ سخن سے ملنے کا اشتیاق بڑھ جاتا۔

نواب معین الدولہ کی صفیؔ سے ملاقات:۔ صفیؔ بڑے یار باش اور زندہ دل تھے وہ ایسے مواقع تلاش کرتے جہاں ان کے دل بہلنے کا سامان ہو۔ ان کے شاگرد اور دوست ان کے اس مزاج سے واقف تھے۔ ان کی خوشنودی کی

خاطر انہیں جلسوں اور میلے میں لے جاتے اور صفیؔ بصد شوق شریک ہوتے۔ صفیؔ کے شاگرد مسلم نے ہمیں نواب معین الدولہ کی صفیؔ سے ملاقات کا یہ قصہ سُنایا جو خود صفیؔ نے ان سے بیان کیا تھا۔

قصّہ یوں ہے کہ ایک دن مغل پورہ والوں اور کوٹلہ عالیجاہ والوں کے درمیان پتنگوں کا مقابلہ چمپا پیٹھ میں ہو رہا تھا۔ صفیؔ کو بھی ان کے دوست اور شاگرد اپنے ساتھ پتنگ بازی کا جلسہ دیکھنے لے گئے۔ اس اثنا میں نواب معین الدولہ کا گزر اس طرف ہوا۔ وہ موٹر میں اپنے محل سرور نگر پیالس جارہے تھے۔ اپنے شوق کی خاطر وہ بھی مجبور ہوئے اور موٹر روک کر پتنگ بازی کا مقابلہ دیکھنے میدان میں اتر پڑے اس وقت نواب صاحب کی ہیٹی میں خنجرؔ بھی موجود تھے انہوں نے دور سے دیکھا کہ ان کے اُستاد صفیؔ بھی جلسے میں شریک ہیں تو وہ ان سے ملنے گئے۔ بہت ادب احترام سے ان کو ملتے دیکھا تو خنجرؔ کو بُلا بھیجا اور پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں جن سے تم ملتے ہوئے جھکے جارہے ہو۔ انہوں نے ادباً عرض کیا کہ وہ ان کے اُستاد صفیؔ ہیں۔ صفیؔ کا غائبانہ تعارف نواب صاحب کو تھا وہ صفیؔ سے ملنے کے شائق تھے۔ یہ ایسا نادر موقعہ تھا کہ خود صفیؔ اُنکے سامنے تھے بھلا معین الدولہ جیسے شکاری یہ شکار کیوں کر چھوڑتے انہوں نے موقع کو غنیمت جانا اور خنجرؔ سے کہا کہ وہ صفیؔ کو بلا لائیں۔ خنجرؔ دوڑے دوڑے گئے اور صفیؔ سے کہا کہ چلئے نواب صاحب نے یاد کیا ہے۔ صفیؔ بڑے پابند وضع اور سلیقہ مند تھے انہوں نے عذر خواہی کی کہ وہ پھر کسی وقت نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گے نواب صاحب نے ان کا جواب سُنا تو کہلا بھیجا کہ اگر وہ نہیں آتے تو خود نواب صاحب ان سے ملنے آئیں گے۔ جب خنجرؔ نے یہ بات آکر صفیؔ کو سُنائی تو وہ نواب صاحب کی قدردانی سے متاثر ہوئے اور جس حالت میں تھے اسی حالت میں نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ نواب صاحب بہت عزّت سے ملے اور مجبور کرکے

اپنے ساتھ موٹر میں بٹھالیا اور سیدھے اپنے بنگلہ سرورنگر پہنچے۔

دربار معین سے صفیؔ کی وابستگی:۔ یہ بات در پردہ راز رہتی کہ نواب معین الدولہ کے دربار میں صفیؔ کی رسائی کب ہوئی اور کب تک وہ دربار معین سے وابستہ رہے۔ لیکن خوش قسمتی سے صفیؔ کا لکھا ہوا ایک خط ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ تو نہیں معلوم ہوتا کہ کس کو لکھا ہے لیکن طرز تخاطب بتاتا ہے کہ مخاطب کا احترام صفیؔ کے دل میں زیادہ تھا۔ خط کے القاب "حضرت استادی زادہ اللہ فیضہ" اور خط کے جملے "آپ میرے محسن اور خیر خواہ ہیں"۔ ان الفاظ سے جذبہ عقیدت مندی نمایاں ہے اس وقت اس شخصیت کی کھوج میں جانے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمیں تو یہ جاننا ہے کہ نواب معین الدولہ کے دربار میں صفیؔ کی رسائی کب اور کس سنہ میں ہوئی مزید اس خط سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ معین الدولہ کا سلوک صفیؔ کے ساتھ کیسا رہا اور خود صفیؔ کے کیا احساسات تھے۔

اس خط پر تاریخ ۱۸ فروری ۱۳۳۸ ف (۱۸ رمضان ۷ھ ۱۳۴ھ ۹ار فروری ۱۹۲۹ء) درج ہے۔ صفیؔ لکھتے ہیں "کچھ دنوں سے میرا قیام سرورنگر رہا ہے، کوئی دو مہینے سے نواب معین الدولہ کے پاس آجا رہا ہوں۔ یاد فرمائی کا کوئی وقت نہیں۔ جب موٹر آئے چلا جانا پڑتا ہے۔ دن ضائع تو نہیں جارہے ہیں لیکن مقرر کچھ نہیں ہوا..... میں نہایت خلوص قلب سے دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ انہیں خاص حفاظت میں رکھے"۔ آگے فرماتے ہیں "علی الحساب سرفرازی کا حساب ہی کیا۔ ساتھ کھاتا ہوں ساتھ پیتا ہوں۔ ہم نوالہ ہم پیالہ بنا ہوا ہوں۔ ابھی تک عزت سے گذر رہی ہے۔ آئندہ اللہ مالک ہے۔ میرے ذمہ صرف یہی کام ہے کہ فرمائش پر اپنی غزلیں سُنا سنا کر ان کا دل خوش کیا کروں"۔

امراء کا دربار مصاحبوں کی رقابتوں کی آماجگاہ ہوتی ہی ہے۔ معین الدولہ کا دربار حاسدوں سے کب خالی تھا۔ بھلا وہ کیسے گوارا کرتے کہ کل کے آئے ہوئے صفیؔ کو نواب صاحب کی

ہم نشینی اور ان کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہونے کا شرف ملے۔ صفی کی دور رس نگاہوں نے درباری نزاکتوں کو بھانپ لیا تھا۔ اِس اندیشہ کا ذکر انہوں نے اس خط میں یوں کیا ہے" آپ میرے محسن اور خیر خواہ ہیں اس لئے اس بات کی خبر کردی۔ حقیقی مسرت ہر ایک کو نہیں ہوتی اور میں ہر ایک کو اپنی طرف سے آگاہ بھی کیوں کرتا۔ وہاں بھی اخوان الشیاطین لگے ہوئے ہیں۔

شور بختان باآرزو خواہند　　　مقبلان رازوال نعمت وجاہ

لیکن نواب معین الدولہ ایک بلند حوصلہ، نیک نفس اور بارعب امیر تھے۔ ان کی عنایات صفی پر بڑھتی ہی گئیں اور کسی سازشی کو سازش کا موقع نہ ملا۔ موٹر انہیں لینے روز آتی اور کبھی موٹر صفی کے بغیر واپس آتی تو نواب اپنے کسی صاحبزادے کو بھجواتے۔ وہ صاحبزادے سیدھے صفی کے مکان آکر گھر میں داخل ہوتے۔ بے تکلفی سے کھونٹی پر ٹنگی ہوئی شیروانی پہنا کر موٹر میں بٹھا لیتے۔ اس وقت صفی جیب چاپ بیٹھ کر حاضر خدمت ہوتے۔

بنگلور کا سفر:- ایک دفعہ نواب معین الدولہ بغرض تفریح اور تبدیل آب وہوا اپنے محل اور اپنے اسٹاف کے ساتھ بنگلور تشریف لے گئے۔ صفی کو بھی اپنا شریک سفر بنا لیا اپنی غزل کے ایک مقطع میں سفر بنگلور کا اِس طرح ذکر کیا ہے ؂

کیا لطف سیر ذوق تماشہ کہیں صفی　　　کل سات آٹھ دن تو رہے بنگلور میں

درباری مصروفیتیں:- جناب مسلم بیان فرماتے ہیں کہ صفی نے نواب معین الدولہ کے دو فرزندان کی بسم اللہ پڑھائی تھی۔ ہر بسم اللہ کی تقریب پر نواب صاحب نے اُستاد صفی کو دو سو روپیہ اور گیارہ اشرفی پیش کی۔ گیارہ اشرفی تو اُستاد نے اپنی جیب میں رکھیں دو سو روپیہ ملازمین میں تقسیم کردیئے۔

نواب صاحب کے صاحبزادے شاعری میں صفی کے شاگرد تھے۔ خاص طور سے نواب کے چہیتے فرزند نواب مظفر الدین خاں عرف "شاہ صاحب" کو صفی سے زیادہ ربط تھا۔ ان کے بنگلے نارائن پور ہوس اے سی گارڈ میں طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ جن میں صفی اپنے شاگردوں کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؂

شاہ صاحب ہیں شاہ کار مجھے ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ائے صفی خوب یہ طرح دی ہے

دربار سے وظیفہ :- اب یہ راز ہی ہے کہ صفی کو معین الدولہ کے دربار سے کیا وظیفہ ملتا تھا۔ متذکرہ خط دربار معین میں رسائی کے دو ماہ بعد لکھا گیا ہے۔

درباری مگر حرص و طمع سے دور :- صفی جیسے فقیر منش۔ قلندر طبیعت اور رند مشرب کو کبھی دولت وجاہ و منصب کی طمع نہیں رہی۔ بعض وقت ایسا ہوا کہ عالم سرور میں نواب نے لپٹا لپٹا کے پوچھا کہ صفی مانگو کیا چاہتے ہو لیکن صفی ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ سرکار میرے لئے سب کچھ ہیں سرکار سلامت رہیں ؎ تندرستی چاہیئے سرکار کی!

معین الدولہ نے مانگنے والوں کو کیا نہیں دیا! اپنے مقربین اور متوسلین پر داد و دہش کا یہ عالم رہا کہ مناصب دئے۔ باغات، زمینات اور مکانات بخش دے، زیور اور روپے پیسے سے نوازا لیکن صفی نے نہیں مانگا۔ صفی فرماتے تھے کہ اگر میں نواب کے اندازے سے زیادہ مانگتا تو وہ مجھے لالچی سمجھتے اور اگر اندازے سے کم مانگتا تو ان کے نزدیک کم ظرف ٹھہرتا۔ ایسے ہی وقت کیلئے فرمایا ہے ؎

ہم فقط حوصلۂ اہل کرم دیکھتے ہیں ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ اب جو بے مانگے کے مل جائے مقدر اپنا

بے مانگے علی الحساب سرفرازیاں ان کے لئے کافی تھیں۔ گھر کا تھوڑا خرچ نکل جائے اور ایک گونہ بے خودی کیلئے مئے نوشی کا سامان ہو جائے۔ اس سے زیادہ کی انہیں خواہش نہیں ہوئی۔

مدح سرائی و قصیدہ خوانی :- دربار سے وابستہ رہ کر صفی نے مراسم درباداری ادا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن درباری ریشہ دوانیوں لے جا جا پلوسی اور دولت کی ہوس سے ہمیشہ دور رہے وہ بہت خود دار اور مستغنی المزاج واقع ہوئے تھے۔ یقیناً ایک طویل عرصہ تک دربارِ معین وابستہ رہ کر قصیدہ خوانی کی ہو گی۔ تعریف میں اشعار کہے ہوں گے۔ وقتاً فوقتاً ضرورت ہوئی تو شعر لکھ کر پیش کرتے ؎

سرکار سے ہو جائے اجازت بھی عطا بھی ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ گھر جا کے پھر آؤں نہ ہو دیر ذرا بھی

حُسنِ طلب کا ایک انداز بھی دیکھئے ؎

صبح کی جلوہ فرمائی پہ مجھ تک یہ خبر آئی
بر آمد ہو چکے سرکار چل اُمید بر آئی

یاد فرمائی ہوئی تو شعر لکھ کر پیش کر دیا ؎

آج دیکھی یاد فرمائی میں یہ تاثیر بھی
میں جو جاگا خواب سے جاگی مری تقدیر بھی

مزاج پُرسی بھی شعر کی زبان میں ہوتی ہے ؎

جو کھانسی شدت نزلہ سے تھی ہر بار کیسی ہے
طبیعت کل کی بسنت آج ائے سرکار کیسی ہے

عینک عطا ہوئی تو کہا ؏ سرکار نے عینک نہیں بینائی دی۔

گھڑی ملی تو ؏ گھڑیال ملی کہ وقت پر کام کروں

قصیدہ ہو۔ نظم ہو۔ قطعہ۔ رُباعی یا کوئی شعر ایک کارڈ پر اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھ کر نواب کے آگے پیش کرتے یا مقربین میں کسی کے ذریعہ بھجواتے۔ نواب حسنِ طلب کے اداشناس تھے۔ کام بن جاتا۔

صفیؔ کی پُر گوئی اور بدیہہ گوئی تو مشہور اور مسلم ہے صدہا شعر کہے ہوں گے لیکن دستبُردِ زمانہ سے کچھ محفوظ نہیں رہا۔ اگر وہ تمام ذخیرہ شعری دستیاب ہو جاتا تو ایک نایاب اور دلچسپ مجموعہ مرتب ہو سکتا تھا۔ صفیؔ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے اشعار کے نہایت خوش خط کارڈ محترم شمس الدین تاباں مرحوم شاگردِ صفیؔ کے ذخیرہ میں ان کی مہربانی سے دیکھنے کو ملے تھے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

بگرامی ملاحظہ سرکار دام اقبالہٗ:۔

بیدار ہوا غریب گھر سی کے لئے
یاد کوئی امیر منز کرسی کے لئے

ہوتے ہی سحر ہر اک کو اپنی سوجھی
فدوی آیا مزاج پُرسی کے لئے

خاکسار صفیؔ

پھر ملاحظہ ہو:۔

ھُو المُعین

ہر ایک سے ملاپ مسرت کے ساتھ ہے
برتاؤ جس کسی سے ہے عزت کے ساتھ ہے
مشقِ سخن بھی دادِ سخن بھی ہے ساتھ ساتھ
جینے کا لطف تیری محبت کے ساتھ ہے

عرضی صفی

ھوالمعین

بہارِ نوجوانی دیکھ لوں آغازِ پیری میں
نظر آجائے آزادی کا جلوہ ہر اسیری میں
مرے سرکار کی چشمِ عطا مجھ پر جو پڑ جائے
امیری کا مزہ آئے محرم کی فقیری میں

عرضی صفی

بتوسط میاں ثناءاللہ خاں صاحب :۔

دُعا گو ہوں میں مدح خوانی کے ساتھ
عطا اور پھر قدر دانی کے ساتھ
صفی کھانے پینے کی کیا فکر ہے
ملی اشرفی شیروانی کے ساتھ

ھوالمعین

قرض خواہوں سے خلاصی جو ذرا پائی ہے
رات میں کچھ مجھے آرام سے نیند آئی ہے

کہاں تک لکھا جائے۔ ذہن کیا تھا شاعری کا مشین تھا۔ چلتے پھرتے شعر ڈھلتے تھے۔ جب چاہا جیسا چاہا لکھا۔ بس یہی آمد تھی اگر انہوں نے نواب معین الدولہ کی شان میں دفتر کے دفتر اس بارہ سال کے طویل عرصہ میں لکھے ہوں تو تعجب کی بات نہیں۔

نواب معین الدولہ کا احترام :۔ صفی حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ وہ کبھی اپنے بے تکلف دوستوں کو خط لکھتے تو اپنا نام یا تخلص لکھنے کی بجائے "صفی" کے اعداد ایک سو اسی ۱۸۰ لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی اس طرزِ نوشت سے سمجھنے والے سمجھ جاتے۔ صفی نے جب دیکھا کہ لفظ "معین" کے اعداد ایک سو ستر ہوتے ہیں اور یہ اعداد ایک سو اسّی سے کم ہیں تو کس کمالِ فن اور ذہانت سے اپنے سرپرست کے نام کی برتری (عظمت) کی لاج رکھ لی۔

ع :- ایک سو اسی ہوں لیکن ایک سو ستر کے بعد۔

دربارِ معین سے وابستگی کی مدت :- صفی نواب معین الد
انتقال تک ان کے دربار سے وابستہ رہے چنانچہ جب "معین سخن" کی
۱۳۴۸ ف - ۱۹۳۸ء - ۱۳۵۷ھ میں ہوئی (یعنی نواب کے انتقال سے دو
تو صفی دربار سے وابستہ تھے۔ تاریخ طباعتِ دیوان کئی بلند پایہ شعراء نے لکھی
شعراء کی محفل میں صفی بھی موجود ہیں۔ انہوں نے جو چونتیس ۳۴ شعر کہے جو س
زیادہ ہیں۔ کلام کی تعریف بھی کی ہے اور صاحبِ کلام کی قصیدہ خوانی بھی۔
بھی ملتا ہے کہ نواب نے انہیں زبانی بھی تاریخ لکھنے ارشاد بھی کیا تھا۔ چند شعر

معین سخن چھپ گیا واہ واہ — یہ آئینِ دلکش یہ طرزِ سخن
امیری میں شانِ فقیری کہیں — کہ بس آپ اپنی جگہ ہیں مگر
ان ہی کی بڑی سب سے ہے بائیگاہ — یہی ہیں امیرِ کبیرِ دکن
غزل کی زباں صاف مضموں صاف — جسے صاف سمجھے ہر اک مرد وزن
زبانی بھی ارشاد عالی ہوا — تمہیں اولاً - ثانیاً - ثالثً
کہو صاف لکھو طباعت کا سال — ہے موزوں و دلکش معین سخن

۱۳۵۸ھ

آخر میں یہ غور کرنا ہے کہ صفی نواب معین الدولہ کی سرکار سے کب تک وابستہ
کیوں؟ نواب معین الدولہ کے دربار سے وابستہ ہونے کے دو ماہ بعد لکھے گ
ایک خط کلام نے حوالہ دیا ہے۔ جس پر تاریخ میں ۱۳۳۸ ف درج ہے۔ نواب مع
انتقال ۱۹ آبان ۱۳۵۰ ف (۲۷ ستمبر ۱۹۴۱ء) سرور نگر میں ہوا۔ اگر ہم متذکر
تاریخ ۱۳۳۸ ف کو وابستگی کی تاریخ قرار دیں تو ۱۳۵۰ ف تک کا درمیانی فص
سال کا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ بارہ سال نواب معین الدولہ کی سرپرستی میں رہے
مقام ہے کہ صفی جیسا خوددار، مستغنی المزاج، نازک طبیعت، شوریدہ سر قلن

امیر کے دربار سے بارہ سال وابستہ رہ کر قصیدہ خوانی کرے اور مراسم درباداری ادا کرتا رہے جب کہ ان کی فقیرانہ شان تو یہ ہے ؎

آبرو کھو کر کوئی کیا اہل دولت سے ملے
پاؤ روٹی لاکھ نعمت ہے جو عزت سے ملے

مگر وہ جو خدائے سخن میر تقی میر نے فرمایا ہے۔ بجا ہے اور صادق آتا ہے ؎

ایسے آہوئے رم خوردہ کی وحشت کھونی مشکل تھی
سحر کیا اعجاز کیا جن لوگوں نے تجھ کو رام کیا

یہ نواب معین الدولہ جیسے شہباز کا کمال ہے کہ انہوں نے صفی جیسے آہوئے رم خوردہ کو رام کیا اور اسیر دام رکھا۔ کئی امیر صفی کے گھر کے چکر لگاتے تھے۔ ایسے طوطئ زمزمہ پرداز کو اپنے دربار کے پنجرے میں بند کرنے کے لئے انہیں لالچ دیتے تھے مگر وہ ایسے آزاد و خود بین تھے کہ از خود کسی کے دروازے پر نہیں گئے۔ معین الدولہ ان سے ملنے کی آرزو رکھتے تھے۔ کئی بار بلوایا آخر کار پتنگوں کے جلسے سے اٹھا کر انہیں اپنے ساتھ لے گئے معین الدولہ کے دربار سے صفی کے طویل عرصہ تک وابستہ رہنے کا راز یہ ہے کہ نواب صاحب خودداری اہل حاجت کا نباہنا جانتے تھے۔ حسن طلب کے بڑے اداشناس تھے صفی کے لئے ان کے دل میں بڑی قدر تھی اور جو برتاؤ ہوتا تھا عزت کے ساتھ ہوتا تھا۔ خیرات کا اندازہ نہ تھا۔ جب ایسا چاہنے والا انہیں ملا تھا تو کیوں نہ وہ نواب معین الدولہ کے گن گاتے اور ان کے لئے وظیفہ دعا گوئی کا حق ادا کرتے ؎

جو دوست ہیں وہ خوش رہیں پاس ہر وقت اے صفی
دشمن رہیں ذلیل ہمارے نواب کے

آخر میں اتنا اضافہ کرنا ہے کہ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء "ادبستان دکن" کی جانب سے اردو گھر مغل پورہ میں "یاد صفی و تاباں" کے ادبی اجلاس کا اہتمام ہوا تھا۔ اس اجلاس میں پروفیسر جناب یوسف سرمست صاحب نے "حضرت صفی اورنگ آبادی" کے عنوان سے اپنا ایک مضمون سنایا موصوف نے اپنے والد محترم جناب تمکین سرمست کا ایک چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا "معین الدولہ کی سال گرہ کے موقع پر ان کا دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ دیوان تمام شرکائے دربار میں تقسیم کیا جانے والا تھا کشتیوں میں

دیوان کے نسخے لائے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے معین الدولہ کے پاس کشتی لائی گئی۔ نواب صاحب صبح سے شام تک یک گونہ بے خودی کے عالم میں رہتے تھے آج تو سال گرہ تھی اس لئے بے خودی کا عالم دو گنا بلکہ سہ گنا تھا جب کشتی پیش کی گئی نواب صاحب نے دیوان اٹھایا۔ شہ نشین سے اتر کر جھومتے جھامتے استاد محترم صفیؔ صاحب قبلہ کی کرسی کے قریب پہونچے دونوں ہاتھوں میں دیوان تھام کر نہایت ہی احترام کے ساتھ دیوان استاد کی نذر کیا تب کہیں حاضرینِ دربار میں دیوان تقسیم ہوا۔“

بدیہہ گوئی

جناب صفیؔ نہ صرف بلند پایہ شاعر تھے بلکہ طرزِ خاص کے ادیب اور دیدہ ور محقق بھی تھے۔ ذہانت، زندہ دلی اور بدیہہ گوئی ان کی شخصیت کے خاص وصف تھے۔ گھر ہو یا بازار، مشاعرہ ہو یا دوستوں کی محفل کوئی جگہ ہو ہر وقت ان کا دماغ حاضر اور دل آمادۂ برجستہ گوئی رہتا تھا ہر محفل میں اپنی روشنیٔ طبع کی بدولت شمعِ محفل بن جاتے افسوس ان کے قریبی دوست اور شاگرد ایک ایک کرکے راہیٔ ملکِ عدم ہوتے گئے اور اپنے ساتھ صفیؔ کی بدیہہ گوئی کا خزانہ بھی لے گئے۔ سُنی سُنائی چند باتوں کے سوا اب کچھ باقی نہ رہا۔ جناب صفیؔ کو دیکھنے، سُننے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے والے ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں مگر حیرت ہے کہ وہ بھی مُہر بہ لب ہیں۔ بھلا ہو جناب تاباںؔ مرحوم کا کہ انہوں نے میری خواہش پر اپنے اندوختہ سے ایک کاغذ نکال کر دیا تھا جس میں ان کے کسی دوست نے جناب صفیؔ کی بدیہہ گوئی کے دو واقعات لکھ کر دیئے تھے۔ ہم اس تحریر کی نقل ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

”حضرت صفیؔ اورنگ آبادی کی بدیہہ گوئی کے بارے میں کئی واقعات ہیں لیکن مجھ تک جو واقعے پہونچے وہ درج ذیل ہیں:۔

"ایک مرتبہ حضرت صفی عالم کیف و مستی میں دار الشفاء سے گذر رہے تھے اتفاقاً لڑکھڑائے اور سڑک پر گر گئے پولس کے جوانوں نے ان کو ایک راہ گیر سمجھ کر اٹھایا اور تھانہ لے آئے تاکہ پولیس انسپکٹر آنے کے بعد چالان کیا جائے۔ اسوقت بنّے صاحب انسپکٹر تھے وہ حضرت صفی سے واقف تھے اور ان کے مرتبہ کو جانتے تھے۔ جیسے ہی ان کی نظر حضرت صفی پر پڑی جوانوں پر برہم ہوئے کہ یہ کیا ہے۔ اس وقت صفی بھی ہوش میں آگئے اور جب احول پر نظر پڑی تو برجستہ کہا کہ ؎

قصور بادہ نوشی ہے نہ اس میں جرم ساقی ہے مرا بے ہوش ہونا "واردات اتفاقی" ہے

دیکھا آپ نے کس مزے کے ساتھ کوتوالی کی ایک اصطلاح کو منظوم کیا۔"

(۲) ایک مرتبہ حضرت صفی اپنے ایک بے تکلف دوست معین پاشاہ (اور غالباً شاگرد) کے ساتھ "دکن وائن" میں بیٹھے ہوئے "نا و نوش" میں مشغول تھے اس اثناء میں ان کی نظر اپنے ایک دوست حبیب .... پر پڑھی۔ ابھی انہوں نے پاشاہ سے کہا ہی تھا کہ "پاشاہ ابھی ابھی حبیب ادھر سے گزرا ہے" کہ حبیب صاحب نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ پاشاہ سے کہا کہ خیر جانے دو بات دور ہو گئی اور بولے اچھا لکھو ؎

رخ حبیب سے ہٹ کر جو سوئے طور گئی قصور اپنی نظر کا ہے بات دور گئی

رشید انصاری

صفی کی بلندی شعر کا معترف

حضرت خواجہ عبد العلی صدیقی صاحب مرحوم دکن کے ایک باکمال شاعر تھے۔ سخن گو بھی اور سخن فہم بھی۔ جناب صفی کے ہم عصر اور ان کے دیدہ و شنیدہ۔ آپ کا ایک یادگار مضمون "دلچسپ ادبی صحبتیں" رسالہ قلم کار (حیدر آباد) ماہ اپریل و مئی ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں دو واقعہ بھی صفی کی سخن فہمی اور ذہانت کے بارے میں لکھے تھے۔ ہم محترم صدیقی صاحب کے زمودہ بیان کو بطور تبرک اپنے مضمون میں درج کرنے کی سعادت

حاصل کرتے ہیں

"جس روز علامہ ضامن کنتوری کے دولت کدے پر مشاعرہ ہے اس روز صفی اورنگ آبادی مشکل سے آتے ہیں۔ اہل ذوق کی قدردانی کہیے یا ناعاقبت اندیشی ہر شخص کا اصرار صفی طرح میں اپنا کلام سنائیں تھکے ماندے صفی مجبوراً شعر موزوں کرتے ہوئے داخل بزم ہوتے ہیں نہ نظر ثانی کے لیے وقت نہ غور مکرر کا موقع۔ بھلا زود امروزی میں لغزش ہوتی ہے مطلع پیش کرتے ہیں ؎

بزم میں انجان نہ بن اے آفت جان دیکھ کر
لوگ ہنستے ہیں مجھے ناخواندہ مہمان دیکھ کر

علامہ ضامن مکرر سننے کی محض اس لئے خواہش کرتے ہیں کہ "انجان" اردو ہے اس لئے اعلان نون لابدی تیور سے صفی تاڑ جاتے ہیں اور مکرر وہی مطلع سناتے ہیں مگر کس قدر لطیف فرق کے ساتھ؛

بزم میں انجان بن اے آفت جاں دیکھ کر
لوگ ہنستے ہیں مجھے ناخواندہ مہماں دیکھ کر

یا تو ابھی نون غنہ تھا یا ابھی اعلان نون ہو گیا لفظوں میں بظاہر کوئی تبدیلی نہ تھی اس لئے بہ سرعت سریعہ بات سمجھ میں نہ آ سکی۔ بناء علیہ ضامن کہتے ہیں "معاف فرمانا صفی! گراں گوشی کے سبب کچھ غلط فہمی سی ہوئی"۔

نواب اکبر علی خاں اکبر کے دوست کدے پر بزم سخن آراستہ ہے۔ بہبود علی صفی اورنگ آبادی بیٹھے ہوئے ہیں اس اثناء میں نواب تراب یار جنگ بہادر سعید بھی تشریف فرما ہو جاتے ہیں۔ یہ اس خلاف توقع آمد پر صفی کہتے ہیں :-

نواب صاحب! کیسے اور کس طرح تشریف فرمائی ہوئی۔ جواب ملتا ہے۔ "وقت مل گیا کار پر آ گیا"۔

اب صفی کا انداز مخاطبہ دیکھیے (کار پر؟ کار؟ کیا یہ کار بہ املائے الف تو نہیں؟)

نواب صاحب مسکرا دیتے ہیں اس کیفیت بیان سے اہل ادب کی کیفیت اندازی اہل ادب ہی میں جان سکتے ہیں۔"

نایاب قصیدہ بطرز غالب

جناب ابوالنصر محمد خالدی صاحب کے دولت کدے پر مہدی پٹنم میں جناب شمس الدین تاباں۔ جناب سید عبدالحفیظ محفوظ۔ جناب رؤف رحیم فرزند تاباں اور یہ راقم حاضر تھے۔ ذکر صفی سے محفل گرم اور رنگ پر آئی ہوئی تھی۔ یک بارگی جناب خالدی نے کچھ سوچا اور تھوڑی دیر یادِ ماضی میں گم رہنے کے بعد کاغذ پر ڈیڑھ شعر مرتسم فرمایا ؎

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے" بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے
گنجلک کہنے ہی میں ہے جو کوئی استادی ....

فرمایا کہ غالب نے چکنی ڈلی" پر تیرہ شعر فی البدیہہ کہے تھے۔ لیکن صفی مرحوم نے عمر یافعی کے چھوٹے بھائی کی شادی کے موقع پر اسی ردیف و قافیہ میں تقریباً چالیس شعر کہے تھے اور سنایا تھا۔ موصوف نے خواہش کا اظہار کیا کہ اس نایاب قصیدہ کو ہم ڈھونڈ نکالیں اتفاق کہیے یا خوش قسمتی کہ جناب عمر یافعی مرحوم کے بھانجوں استاد محمد بن عیسیٰ صاحب اور حسین یافعی صاحب سے بڑے مراسم اچھے خاصے مخلصانہ ہیں جب میں نے اپنا مدعائے دلی بیان کیا تو ان دو صاحبوں نے ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔

صفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دیوانوں یا انتخاب کلام یا کسی تذکرہ میں یہ قصیدہ موجود نہیں ہے نہ کسی نے اس کا تذکرہ کیا۔ البتہ صفی کے ایک قدیم شاگرد سید غوث یقین نے صفی کا کلام دیوان کی صورت میں" فردوس صفی" کے نام سے پاکستان سے شائع کیا تو تعارفی مضمون" آپ سے ملیے" میں اس قصیدہ کی نشان دہی اس حد تک کی" اسی طرح ایک اور قصیدہ حضرت غالب کی چکنی ڈلی والے قطعہ پر اپنے ایک بے تکلف

دوست کی شادی کے موقع پر کہا تھا (جس کا صرف آخری شعر ہمیں یاد ہے)
لیکن جس بات کا اظہار کرنا چاہیئے تھا اسے نہایت حُسن کے ساتھ تضمیناً اس طرح
کہہ دیا ہے

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیئے
بات غالبؔ کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے

اس دوران میں نے بہت کوشش کی کہ قصیدہ یا کچھ اشعار شاگردانِ صفی یا
واقف کار لوگوں سے حاصل کروں۔ لیکن سنے سنائے ایک دو شعر سے زیادہ
کسی نے کچھ نہیں سُنایا بلکہ قصیدہ کی شان ترقیم کے بارے میں عجیب عجیب مختلف
روایتیں سُننے کو ملیں۔ آخر کار جوئندہ یابندہ کے مصداق کئی مہینوں کی جدوجہد
اور اُمید وبیم کے درمیان یہ گنج شائگان میرے ہاتھ لگا۔ جسے حسین یافعی صاحب نے
بہ تلاش بسیار اپنے اثاث البیت سے ڈھونڈ نکالا اور از راہِ مہربانی وعلم دوستی
میرے حوالے کیا۔

اس قصیدہ کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ جناب محمد بن عمر صلاح صاحب مرحوم
(جن کا کتاب خانہ حیدرآباد میں بہت مشہور تھا) چھوٹے بھائی محمد بن صلاح کی
شادی بروز یکشنبہ ۲ شعبان ۱۳۴۵ھ ہوئی۔ محفلِ عقد میں حیدرآباد کے ایک
اچھے شاعر جناب قادر حسین قادر نے جو اُستاد داغ کے شاگرد تھے اور درجہ اُستادی کا
رکھتے تھے سولہ اشعار کا "سہرا" لکھ کر سُنایا تھا اور قطعہ تاریخ عقد یوں کہا تھا۔

خوشی کیوں نہ ہو اس کی احباب کو
بنا ہے بنا جو محمد صلاح

خجستہ ہو عقد محمد کہو
جو تھی فکرِ تاریخ دِل نے کہا

۱۳۴۵ھ

یہ شادی محلہ بیگم بازار بلدہ حیدرآباد میں ہوئی لیکن ولیمہ دوسرے دن
عمر یافعی صاحب مرحوم کے آبائی مکان میں ہوا جو اس وقت بیگم کی مسجد (روبرو کہ
مسجد کے متصل واقع تھا۔ اس گھر میں بروز ولیمہ صفی نے قصیدہ (نظم) سُنایا تھا۔

اس وقت ان کی عمر صرف پینتیس ۳۵ سال تھی (از روئے تاریخ پیدائش ۱۳۱۰ھ)

مرزا غالب جب کلکتہ گئے تھے تو ایک مجلس میں ان کے دوست کرم حسین نے چکنی ڈلی پیش کر کے ان سے خواہش کی کہ اس چکنی ڈلی کی کچھ تشبیہات نظم کریں، چنانچہ غالب نے وہیں بیٹھے بیٹھے فی البدیہہ تیرہ اشعار کا قطعہ لکھ کر اپنے دوست کے حوالے کیا، مختصر سا یہ قطعہ تشبیہہ، استعارہ اور تلمیح کا ایک دلکش مرقع ہے لیکن اس کے ساتھ اس پر غالب کی مشکل پسندی اور فارسی تراکیب کا ملمع چڑھا ہوا ہے صفی نے غالب کا اعتراف کمال کرتے ہوئے کہ "بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے" اٹھاون ۵۸ شعر کا قصیدہ غالب کے تتبع میں لکھا اگرچہ یہ فی البدیہہ نہیں ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ اور یہ ماننا پڑیگا کہ اردو شاعری کا دامن غالب کے اس قطعہ کے بعد کسی اور تقلیدی نمونہ سے خالی ہے۔ تمام قصیدہ "تشبیہات" استعارات اور تلمیحات و محاورات کی خوبیوں سے مرصع ہے۔ طرفہ یہ کہ طبیعت کی روانی چڑھتے دریا کی طرح بڑی سادگی اور پرکاری کے ساتھ از اول تا آخر رواں دواں ہے۔ الحاصل یہ قصیدہ صفی کے سخنورانہ حسن کلام۔ قدرت زبان اور ان کے خاص شگفتہ اور دلکش انداز بیان کا آئینہ دار ہے۔

یہ طویل قصیدہ تمام تر بہمہ انتخاب ہے۔

در تہنیت شادی میمنت آبادی مجتبیٰ محمد بن صلاح بن داؤد صاحب زاد اللہ لطفہٗ :-

ہے عجب طرفہ تماشا جسے دنیا کہیے	اس میں سچ کی مرن ہے تو بھلا کیا کہیے
بزم شادی اسے کہیے تو یہ ہے سچی بات	شاعری ہے جو اسے اس سے زیادا کہیے
بزم انجم اسے ٹھہرائے تو ہے تشبیہ	سب کہیں گے کہ طریقہ ہے پرانا کہیے
خوان یغما جو کہیں خوان کو تو پس خوردہ	لوگ سچ سمجھیں، اگر کہیے تو ایسا کہیے
کہیے روٹی کو جو رشک مہ و خورشید تو پھر	شاہ کاسے کو نہ کیوں گنبد خضرا کہیے
کہیے پانی کے کٹورے کو جو حوض کوثر	کیوں نہ بریانی کو رشک من و سلویٰ کہیے
تاہ مسند کو بنا دیجیے شعاع خورشید	اور مسند کو تو خورشید سے اچھا اعلیٰ کہیے

یہ کوئی کہنے . بس کہنا ہے الٰہی توبہ
ایسے کہنے کو تو چوں چوں کا مربا کہیے

یعنی تحقیر کسی شئے کی اگر ہو منظور
یدِ بیضا کو ہتیلی کا پھپھولا کہیے

ہو بڑھانا ہی کسی چیز کا گر مدِ نظر
بالا خانہ کو تو چرخ عالم بالا کہیے

دلنشیں ہو جو بری لڑکیوں کی تعریف تو پھر
ایسی صحبت کو تو اندر کا اکھاڑا کہیے

باغ میں مردہ دلی دور اگر ہو جائے
نکہتِ گل کو بہارِ دمِ عیسیٰ کہیے

گوش شنوا ہوں تو پھر گل کو سمجھے بہرا
چشم بینا ہے تو آئینے کو اندھا کہیے

دہن و عارض و گیسو کی ہو تعریف اگر
اسے شیریں اسے عذرا اسے لیلا کہیے

زرِ گل، نکہتِ گل، جلوۂ گل کی تشبیہ
حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا کہیے

کیجئے پابندیٔ الفاظ سے انصاف کا خون
ہو فرنگی کوئی کالا بھی تو گورا کہیے

ہاں مگر اپنی طرف سے تو نہ کہیئے کچھ بھی
یعنی جیسا جسے کہتی ہے یہ دنیا کہیے

یہ عنایت ہے کسی بد کو اگر کہیئے نیک،
یہ شرافت ہے برے کو بھی جو اچھا کہیے

اس نئی روشنی میں اسقدر اندھیر صفی
دوسرا ہو تو اسے کہئے! تمہیں کیا کہئے

ہو جو تاثیر سخن میں اسے جادو کہئے
طبع آ جائے روانی پہ تو دریا کہیے

کیوں گل داغِ جگر کو مہ کنعاں کہئے
بختِ خوابیدہ کو کیوں خواب زلیخا کہیے

فائدہ کیا ہے جو شوقِ دلِ مجنوں لکھیے
واسطہ کیا ہے جو وصفِ رخِ لیلا کہیے

گنجلک کہنے ہی میں ہے جو کوئی استادی
نہ قصیدہ، نہ غزل، صرف معمّا کہیے

بات غالب کی جو تھی ساتھ گئی غالب کے
زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیے

اب میں کہتا ہوں کہ لیجئے مرا کہنا سنئے
یہ نہیں عرض کسی سے مرا کہنا کہئے

بات کہنے میں اگر وقت گذر جاتا ہے
آپ ہی سوچ کے کہیے کہ بھلا کیا کہیے

یہ محمد کی ہے شادی کہ جو ہے ابن صلاح
اور دعوت یہ وہ ہے جس کو ولیما کہیے

مجھ سے نوشاہ سے نوشاہ کے بھائی سے خلوص
جس قدر آپ سمجھیے۔ اسے جتنا کہیے

مجھ سے ان دونوں نے کوئی بھی نہ کی فرمائش — ہاں مگر تھا یہی بعضوں کا تقاضا کہیے

اور تاکید پہ تاکید تھی ہر دم جاری
زور دے کر اسے کہیے بہت اچھا کہیے

اور میں کہ بھلا اپنی کروں کیا تعریف — کوئی کہہ دے جو مری شادی کا سہرا کہیے
دوستانے ہی کو دیتا ہوں میں استعفا — اب مجھے آپ برا کہیے کہ اچھا کہیے
کار و افکار کا یہ رنگ کہ گویم مشکل — مشق بالکل نہیں ہیں پہ مجھے جھوٹا کہیے
یہ تو اک شکل ہوئی اور نہ گویم مشکل — آپ سے طالب انصاف ہے بندا کہیے
نہ ہو تحریر کی فرصت تو بھلا کیا لکھیے — نہ ہو تقریر کی طاقت تو بھلا کیا کہیے

ہاں گئی جس کی عنایت سے مری مردہ دلی
اس کے کہنے کو حریف دم عیسیٰ کہیے

اب ہوئی سوچ کہ "تنگ آمد و سخت آمد" ہے — دل میں جو بات ہے آخر اسے کیسا کہیے
کبھی فرصت کا اشارا کوئی سہرا لکھیے — کبھی غیرت کا تقاضا کہ قصیدا کہیے
کبھی تفتیش کہ لکھیے بھی تو کیا کیا لکھیے — کبھی تشویش کہ کہیے بھی تو کیا کیا کہیے

کبھی یہ فکر کہ تزئین سخن کی خاطر
خوب جی کھول کے نوشاہ کا سراپا کہیے

بال کو لکھیے وبال دل حوران بہشت — رشک ظلمات و حریف شب یلدا کہیے
زلف کو حبل متیں، سنبل و عقرب لکھیے — کافر طرۂ طرار و چلیپا کہیے
سر نوشاہ کی تشبیہ ہو منظور اگر — آسماں اور اسے خیمۂ لیلا کہیے
مانگ کو لکھیے کہ ہے جادۂ راہ ظلمات — اور پھر کاہکشان شب یلدا کہیے
آنکھ کو مانیے صد غیرت چشم آہو — چشم آہو نہ سہی نرگس شہلا کہیے
کہیے رخسار کو گلنار و گل لالہ ہے — اور آئینہ سمجھے کف موسیٰ کہیے
خال کو مشتری و زنگی و ہندو لکھیے — خط کو زنگار و پر زاغ و بنفشا کہیے

لب کو لکھیے کہ ہے یاقوت و عقیق و مرجاں — اور پھر اس سے سوا خضر و مسیحا کہیے
تنگ کہیے جو دہن کو تو جو سمجھے معدوم — کبھی دُرجِ گہر و خاتمِ غنچہ کہیے
سلکِ الماس سے دانتوں کو جو دیجے تشبیہ — کیوں انہیں اور بڑھا کر نہ ثریا کہیے

سیب لکھیے جو زنخداں کو غبغب کو ہلال
رہی گردن تو اُسے گردنِ مینا کہیے

یہ نوالے ہیں چبائے ہوئے سب لوگوں کے — سحر گویانِ سلف کا اسے جھوٹا کہیے
کیوں نباتات جمادات سے دیجے تشبیہ — کہیے ایسا کہ کہیں لوگ دوبارا کہیے
آدمی اشرفِ مخلوق ہے مسجودِ ملک — اس کی عزت ہے اگر خاک کا پتلا کہیے
آج کی بزم ہے تقریبِ ولیمہ کی بزم — جس کی خاطر سے یہ ہے بس اسے دولہا کہیے
اس نے پائی ہے وہ نعمت جو ملی آدم کو — دوسرے لفظوں میں یا پسلی کا جوڑا کہیے
انتظامات اگر بزم کے آجائیں پسند — تو اُسے حضرتِ داعی کا سلیقہ کہیے

اور میں نے جو کہا یہ تو ہے مجذوب کی بڑ
تہنیت اس کو سمجھیے نہ قصیدہ کہیے

مطبوعہ کلام

قبیلۂ عشق کے رشتے ناطے اہلِ جنوں سے بہت قریبی اور گہرے ہیں صفی شاعری کو بھی خاندانِ عشق و جنون سے وابستہ کرتے ہوئے اپنی ایک تحریر میں فرما گئے ہیں "عاشقی بھی ایک جنون ہے مگر میں شاعری کو بھی یہی سمجھتا ہوں" صفی بڑے صاف گو تھے تب ہی تو اپنی افتادِ طبع کے بارے میں دو ٹوک بات کہہ دی ہے

میرے جنوں ہی کا نتیجہ ہے اے صفی — شائع جو آج تک مرا دیوان نہ ہو سکا

تمام تذکرہ نویس اور مضمون نگار اس بات پر متفق ہیں کہ صفی نے اپنے فطری ذوق کی بنا پر اوائلِ شباب ہی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن خود صفی کو اس تحقیق سے

اتفاق نہیں۔ انہوں نے اس حقیقت کی پردہ کشائی اس طرح کی ہے:۔

"نہیں معلوم کتنے برس گذرے مگر یہ اچھی طرح یاد آتا ہے کہ جب سے ہوش سنبھلا ہے شعر کہتا ہوں۔"

ہوش سنبھالنے اور کمسنی کی عمر کتنی! ان رسیدہ بزرگ دادِ سخن تو کیا دیتے، حیرت سے منھ تکا کرتے۔ اگرچہ انہوں نے اپنی کمسنی کو چھپاتے یہ چال بھی چلی ؎

قدرِ سخن کے واسطے اب کیا کروں صفیؔ | داڑھی بڑھائی پھر بھی وہی کمسنی رہی

صفیؔ کا پہلا دیوان:۔ ذہانت اور پرگوئی ان کے لئے خدا کی دین تھی مشق کا سلسلہ جاری تھا کہ خوش قسمتی سے اصلاحِ سخن کے لئے صاحب عالم مرزا منیر الدین ضیاؔ گورگانی دہلوی جیسے باکمال اُستادِ سخن سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ تقریباً بیس سال کی عمر کو پہنچنے تک اپنا ایک دیوان مرتب کر لیا تھا۔ ہمارے اس بیان پر صفیؔ نے اس طرح مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔" بچپن سے خوش خط ہوں اس زمانے کے اشعار کی کاپیاں میں نے سلیقے کے ساتھ بنائی تھیں۔ صفائی کے ساتھ رکھا تھا اور جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا.... وہ سرمایہ وہیں ڈوبا۔"

بات واضح اور صاف ہے لیکن آخر کا ٹیپ کا بند"وہ سرمایہ وہیں ڈوبا" سن کر ہم دریائے حیرت میں ڈوب گئے۔

واقعی یہ مسئلہ ایک عقدۂ لاینحل بنا رہتا اگر اس کی گرہ کشائی کا غیب سے سامان فراہم نہ ہوتا" مردے از غیب برون آید و کارے بکند" کے مصداق جناب ابوالنصر محمد خالدی صاحب نے اِس رازِ بستہ کو یوں فاش کرتے ہوئے فرمایا کہ جب صفیؔ کے والد حکیم منیر الدین کو رکاب گنج (روبرو ہائی کورٹ) والے مکان میں فالج ہوا تو صفیؔ وہاں سے نقل مکانی کرائے کے مکان واقع سوق، میر کی کمان میں اپنے بیمار والد اور علاتی والدہ (حضرت اماں) کے ساتھ منتقل ہو گئے جناب خالدی بر بنائے روابط مخلصانہ روزانہ صفیؔ مرحوم سے ملنے ان کے گھر جایا کرتے تھے۔ صفیؔ سے ملنے جب ایک دن جناب خالدی ان کے گھر گئے تو دیکھا کہ بڑی بے چینی سے

وہ ان کے منتظر بیٹھے ہیں۔ جناب خالدی کو دیکھتے ہی وہ اپنے سرمایۂ شعری جس کو صفائی
کے ساتھ لکھا تھا اور سلیقے سے جمع رکھا تھا اور پھر جان سے زیادہ عزیز تھا جناب خالدی کے
ہاتھ میں دے دیا۔ اپنے کلام کے ساتھ اپنے والد کا دیوان بھی دے کر خالدی کو حکم دیا کہ اس
بلندے کو پتھر باندھ کر باؤلی میں ڈبو دیں۔ انکار بن نہ پڑا۔ ایک تو صفی کی شخصیت کا رعب
دوسرے یہ کہ وہ جلال میں تھے۔ حکم بجا لاتے ہی بنی۔ دونوں دیوانوں کا پلندہ بنایا اور پتھر باندھکر
گھر کی باولی میں چھوڑ دیا۔ یہ تھا صفی کا پہلا دیوان جو سپردِ آب کر دیا گیا۔" وہ
سرمایہ وہیں ڈوبا" والی بات اس زمانے کی ہے اپنے دیوان کے ساتھ اپنے والد کا دیوان
بھی کس وجہ سے ڈبو دیا اس راز کو صفی نے پردۂ راز میں رکھا مجال دم زدن کسے گنجائش چوں وچرا کہاں؟

شاعری کے ڈانڈے تو جنون وعشق سے ملے ہوئے ہیں شعرائے متقدمین میں مصحفی
جیسے باکمال استادِ سخن کو کیا سوجھی معلوم نہیں کہ انہوں نے ایک ایسا ہی کارنامہ انجام دیا تھا۔

سودا ہے نئی بات کا اے جان پرانا　　سب پھینک دیا پھاڑ کے دیوان پرانا

صفی کے دیوان ڈبوئے جانے کی کئی روایتیں سنی اور سنائی گئیں لیکن "شنیدہ کے
بود مانند دیدہ" ایک بڑی معتبر شہادت ہم نے فراہم کی ہے۔ اس واقعہ کی شہادت میں ہم نے جس
گواہ کو پیش کیا ہے وہ ہیں جناب ابو النصر محمد خالدی مرحوم (سابق ریڈر تاریخ اسلام
جامعہ عثمانیہ) باوجود پیرانہ سالی اور علمی مصروفیت بصد شوق اپنے ساتھ لے جا کر سوق میر کی
کمان کے مکان (۵۷۴-۲-۲۰) کی وہ باؤلی بتائی تھی جس میں خود اپنے ہاتھ سے صفی کا
گنج گراں مایہ ڈبویا تھا۔ پانی سے بھرپور چھوٹی سی باؤلی ساٹھ پینسٹھ سال گذر جانے کے بعد
بھی اتمام حجت کیلئے اس مکان میں موجود ہے۔

صفی نے اپنی کائنات شعر دریا برد کر دی لیکن ان ناپید اشیاء کی یاد آخری زمانے تک
ان کو یوں آتی رہی جیسے انہوں نے اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں غرقِ آب کر دیا ہو ؎

بہہ گئے کچھ جل گئے، چوری گئے کچھ اے صفی　　ہائے مجھ کو یاد آتی ہے مرے اشعار کی

اشعار کے بہہ جانے والی بات تو سمجھ میں آتی ہے لیکن جل جانے اور چوری ہو جانے والے

اشعار کا واقعہ ابھی تک صیغہ راز میں ہے۔ ویسے دنیائے ادب میں ادبی سرقے کی بات نئی واردات نہیں ہے۔ ذہن کی چالاکی اور ہاتھ کی صفائی کی کارفرمائی یہاں بھی ہے۔ مصحفی کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا تھا ؎

اے مصحفی پورب ہی میں شاعر نہ ہوا میں دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا۔

اگر صفی جیسی لاابالی اور قلندرانہ طبیعت رکھنے والے شاعر کا دیوان چوری گیا تو تعجب کی بات کیا ہے؟ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ واقعہ ہے کہ صفی نے اپنے جواہر پارے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے کوڑیوں کے مول بیچ ڈالے اور یہ بھی ہے کہ اس اقلیم سخن کے تاجدار کا دل اتنا غنی تھا کہ مانگنے والوں کے کشکول کو کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔

صفی کا اپنا مرتب کردہ دیوان پراگندہ:۔ صفی تغزل کے بلند پایہ شاعر تھے لیکن انہوں نے شہرت کی بجائے گوشۂ عزلت کو پسند کیا۔ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا اور نہ کبھی شاعری کو ذریعہ عزت سمجھا۔ حیدرآباد کا ایک محدود طبقہ ہی ان کی شاعری سے واقف تھا۔ ادبی حیثیت سے ان کے فن شاعری اور حالات زندگی پر باقاعدہ کسی نے قلم نہیں اُٹھایا۔ اس وقت کے حکمراں نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کا پچیس[۲۵] سالہ جشن سلور جوبلی سنہ ۱۹۳۶ء میں بڑے شاندار پیمانے پر حیدرآباد میں منایا گیا تھا۔ اس جشن کی یادگار میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مسیحا نفسی کے ہاتھوں شعرائے دکن کے تین تذکرے "مرقع سخن" کے نام سے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے شائع ہوئے۔ مرقع سخن جلد اوّل میں حیدرآباد کے پچیس[۲۵] شعراء کے حالات زندگی، نمونہ کلام اور تصاویر موجود ہیں۔ پہلی مرتبہ دکن کے اہل علم اصحاب نے تفصیلی مقالے سپرد قلم کر کے اہل ملک کو ان صاحبانِ کمال شعرائے دکن سے روشناس کرایا۔ اسی مرقع سخن جلد اول میں صفی پر صاحبزادہ میر اشرف علی خاں خازنِ بزم اردو کا چوہتر صفحات پر محیط ایک مقالہ موجود ہے جس میں پہلی مرتبہ صفی کے حالاتِ زندگی اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے واضح ہے کہ صفی نے اپنا ایک دیوان مرتب کیا تھا چنانچہ مقالہ نگار لکھتے ہیں:۔

"ان کا دیوان پیشِ نظر ہے اور انہوں نے میری طلب پر مجھے دیا ہے۔ تقریباً مکمل و مرتب ہے۔ اس کا نام "پراگندہ" سنہری حروف میں منبت ہے۔ خدا کرے یہ سرمایہ جلد چھپ کر ایک ادبی اضافہ کا کام دے۔"

یقیناً صفی کی رباعیات، مثنوی اور قصائد وغیرہ بھی اس دیوان میں ہونگے۔ لیکن صاحب مقالہ نے اتنا بتایا کہ "صفی" کی رباعیات بھی کوئی سو کے قریب اور ہر قسم کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

کئی معتبر اصحاب اِس بات کے گواہ ہیں کہ صفی نے اپنی غزلیں اور دیگر کلام نہایت خوش خط لکھا تھا جبکہ وہ اچھے خطاط بھی تھے۔ جو اشعار "بہہ گئے"، چوری گئے اور جل گئے ان کو کہاں سے لایا جائے۔ "پراگندہ" ہی ان کے لئے غنیمت تھا۔ فرماتے ہیں ؎

چند اوراق ہیں جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی   اب میں کھوئے دیوان کہاں سے لاؤں

اپنے دیوان کے ایک ایک ورق کو وہ چاندی کا ورق سمجھتے رہے ؎

فکر دیوان میں پریشان ہوں دن رات صفی   آج کل ہے مجھے چاندی کا ورق ہر کاغذ

اب ان کے دل میں اپنے دیوان کی اتنی عظمت اور قدر پیدا ہو گئی تھی کہ دیوان کے ساتھ کسی کی ذراسی بے اعتنائی ان کے لئے تکلیف دہ تھی ؎

دیوان کو صفی کے نہ پامال کیجئے   کچھ تو لحاظ کیجئے آخر کتاب ہے

مرقع سخن جلد اول کے جس مقالے کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ صفی کے انتقال (۱۹۵۴ء) سے انیس ۱۹ سال پہلے لکھا گیا تھا اور انیس ۱۹ سال کی طویل مدت میں ظاہر ہے صفی جیسے پُر گو اور زود نویس استادِ سخن نے کئی غزلیں اور کئی ہزار اشعار لکھے ہوں گے اور اپنے دیوان "پراگندہ" کی زینت بنائے ہوں گے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق آگے کے بیان سے ہوگی۔

جناب ابو محمد عمر بن صلاح یافعی کا جمع کردہ دیوان:- مرقع سخن جلد اول کے بیان کی روشنی میں ہم صفی کی ایک تحریر ان کے اپنے دیوان جمع کرنے کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں:-

"مولوی ابو محمد عمر یافعی کے تقاضوں پر آج سے مسلسل سال بھر پہلے میں نے اپنا

دیوان جمع کرنا شروع کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کُلیاتِ حضرت کیفیؔ کے طبع کے بعد ہی اس کام کی ابتداء کریں گے۔

جب نام آیا ہے تو بتانا ضروری ہے کہ ابو محمد عمر بن صلاح یافعی کا قیام مغل پورہ میں صفیؔ کے مکان کے قریب تھا۔ آپ کا کتاب خانہ حیدرآباد میں بڑی شہرت رکھتا تھا جس میں تمام علوم و فنون پر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا بیش بہا ذخیرہ موجود تھا۔ جناب یافعی صاحبِ ذوق ہونے کے علاوہ اچھے محقق بھی تھے۔ صفیؔ اور جناب یافعی میں باہم خلوص و محبت کا رشتہ تھا۔ جناب یافعی چاہتے تھے کہ صفیؔ کا دیوان چھپ جائے۔ انہوں نے بذاتِ خود صفیؔ کا بہت کلام جمع کیا تھا اور اپنے بھانجے جناب حسین یافعی سے خوش خط حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھوا کر دیوان کی صورت میں مرتب بھی کر لیا تھا۔ اس کے کاتب جناب حسین یافعی نے مجھے یہ بات بتائی اور تصدیق کی۔ لیکن دیوان کی طباعت کی نوبت آنے سے پیشتر جناب یافعی کی زندگی کا چراغ گُل ہو گیا۔ جناب یافعی دُنیا سے رخصت ہوئے اور صفیؔ کے کلام کا مرتب کردہ دیوان نہ جانے کس کی نظرِ انتخاب کی نذر ہو گیا۔

ایک رازِ سربستہ کا انکشاف: — جناب صالح بن سعید المصلی حالی صفیؔ کے شاگرد تھے انہیں صفیؔ سے اتنا قرب نصیب تھا کہ صفیؔ نے اپنی زندگی کی آخری سانس ان ہی کے سینے پر لی اور یہ بات سبھی جانتے ہیں۔ پروفیسر مبارز الدین رفعت مرحوم کی کتاب "انتخاب کلام صفیؔ اورنگ آبادی" پر جناب حالی نے اپنے قلم سے حاشیہ آرائی کی ہے۔ اتفاق سے یہ کتاب ایک دوست کی مہربانی سے مجھے دیکھنے کو ملی۔ جناب حالی نے لکھا:۔

حضرت کے طبع دیوان کی کوشش جاری تھی کافی سرمایہ بھی جمع ہو چکا تھا جس کے خازن حبیب محمد صاحب صدر امین پولیس تھے۔ جب ابتدائی مصارف کے لئے رقم طلب کی گئی تو کہا کہ سرکاری جوبلی کے انتظامات میں باغ عام میں تھا اور یہ رقم میری جیب میں بصورتِ نوٹ رکھی ہوئی تھی۔ کسی جیب کترے نے مار دیا۔ اس کے بعد تو معاملہ ختم ہو گیا"۔

یہ تو صفیؔ کے اپنے دوستوں کا معاملہ ہے۔ ہمارا کچھ کہنا بے ادبی ہوگی۔ خود صفیؔ کو اپنے

دوستوں کے مخلصانہ سلوک کا احساس تھا ۔

مجھے احباب سے کیا کام بننے کا یقیں ہوتا ‏ ‏ ‏ ‏ یہ باتونی ہیں ان کے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا

فردوس :۔ جس زمانے میں صفی امیر پائیگاہ نواب معین الدولہ کے دربار سے وابستہ تھے تو نواب صاحب مرحوم نے ازراہ قدردانی صفی کے کلام کو طبع کرانا چاہا۔ ان کی خواہش کے احترام میں صفی نے اپنی دو سو غزلیات حروف تہجی میں مرتب کیں اور اس انتخاب کا نام فردوس رکھا نواب صاحب دو ہزار روپے کسی ادبی شخصیت کے حوالے کئے مگر معلوم نہیں "فردوس" کیوں شائع نہ ہو سکا۔ خود صفی نے یہ واقعہ اپنے شاگرد جناب مسلم کو سنایا اور جناب مسلم نے راقم کو سنایا۔

صفی کے انتقال کے بعد :۔ صفی کے مشہور شاگرد میر نظیر علی عدیل نے اپنے ایک مضمون مندرجہ سب رس "یادگار صفی نمبر" سنہ ۱۹۵۶ء صفی کے شاگردوں کی تعداد چار سو بتائی ہے۔

صفی کے انتقال کے بعد تمام شاگرد قدیم و جدید (چند مرحومین کو چھوڑ کر) بقید حیات تھے اپنے استاد کی یادگار اور ان کے نام اور کام کو زندہ جاوید بنانے کی کئی انجمنیں قائم کیں۔ بزم تلامذہ صفی تو پہلے ہی سے صفی کی حیات میں موجود تھی۔ دوسری انجمنیں دبستان دکن۔ ادبستان صفی صفی سوسائٹی اور ادبستان دکن وغیرہ قائم ہو گئیں جو آج بھی موجود ہیں۔ ہر انجمن کی جانب سے بار بار اعلان ہوتا رہا اس کی جانب سے صفی کا متفرق کلام یکجا ترتیب دے کر دیوان شائع کرنے سعی بلیغ جاری ہے۔ لیکن ایک مدت گذر جانے کے بعد بھی کسی نے اپنے استاد کا دیوان طبع کرا کے خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل نہیں کی۔

انتخاب کلام صفی :۔ محترم جناب خالدی نے انکشاف کیا کہ صفی کے انتقال کے بعد چند اصحاب جن کو صفی مرحوم سے کسی نہ کسی درجہ سے گہرا ربط تھا ایک کمیٹی تشکیل دی تھی جس کا مقصد صفی مرحوم کے جملہ کلام کو یکجا کر کے غزلیات کا موزوں انتخاب شائع کرنا تھا۔ یہ سلسلہ جناب خالدی کی قیام گاہ جامعہ عثمانیہ میں تقریباً دس ماہ جاری رہا۔

اور تقریباً کلام کا خاصہ قابلِ اعتماد انتخاب مرتب ہو چکا تھا۔ لیکن اتفاقات زمانہ نے یہ بساط اُلٹ دی اور یہ انتخاب محرومِ اشاعت ہو گیا۔ لیکن جناب خالدی نے اس انتخاب کو ادارہ ادبیاتِ اُردو میں محفوظ کر دیا تاکہ آئندہ اہلِ ذوق مستفید ہوں۔

انتخابِ کلامِ صفی اورنگ آبادی: — جناب صفی کے انتقال (۱۹۵۴ء) کے بعد جب نو سال کا طویل عرصہ گذر گیا تو جناب مبارز الدین صاحب رفعت سابق اُستاد اُردو۔ فارسی گورنمنٹ آرٹس اینڈ سائنس کالج گلبرگہ نے "انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" کے نام سے ۲ مئی ۱۹۶۱ء میں ۵۲ صفحات کا ایک کتابچہ شائع کیا جہاں تک ہمیں علم ہے۔ یہ صفی کے کلام کا پہلا انتخاب تھا جو پہلی مرتبہ طباعت کے مرحلے میں داخل ہوا۔ اس کتاب میں "مکتبہ داغ" کا آخری بڑا شاعر صفی اورنگ آبادی" کے عنوان سے ایک مقدمہ زیب قرطاس کر کے صفی کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ جناب رفعت جناب خالدی کے حقیقی برادرِ نسبتی تھے اس تعلق سے بر بنائے ادبی ذوق وہ صفی کی خدمت حاضر ہوتے تھے۔ رفعت ان کا تخلص نہیں عرف اور گھر کا نام ہے۔ ان کو صفی سے قریب رہنے اور علمی و ادبی مسائل میں استفادہ کرنے کے مواقع میسر آئے جناب رفعت کہتے ہیں کہ "حضرت صفی نے اپنی زندگی ہی میں دیوان مرتب کر لیا تھا۔ لیکن اسکی اشاعت کی نوبت نہ آئی تھی نہ آئی۔ شاید اس لئے نہ آئی کہ وہ اسے جس اہتمام کے ساتھ شائع کرانا چاہتے تھے اس کے اسباب ان کے ہاں مہیا نہ تھے" آگے لکھتے ہیں کہ "پھر جب بھی حاضر ہوا ان کے تازہ کلام کی نقل برابر حاصل کرتا رہا۔ اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہی دیوان "پراگندہ" تھا۔ جس کا ذکر مرقع سخن جلد اوّل میں ہے۔ اپنے اس دیوان میں حضرت صفی اپنا تازہ کلام بھی لکھتے رہے"۔

رفعت مرحوم نے یہ واقعہ درج کتاب کیا ہے کہ صفی نے اپنے دیوان کی نقل کرنے کی انہیں اجازت دی تھی اور انہوں نے اپنے کسی دوست سے اس کی نقل کروا کر صفی کو

دکھائی تھی۔ صفی نے کچھ دن یہ نقل اپنے ہاں رکھ کر اغلاط درست کئے اور یہ تحریر لکھ کر اپنے دستخط ثبت کر دیئے "بہت غلط نقل ہوا ہے۔ میں نے غلطیاں درست کر دی ہیں۔"

جناب رفعت کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ انتخاب اسی مصدقہ نقل دیوان سے کیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ صفی کے انتقال کے بعد مدت تک وہ یہ سنتے رہے کہ ان کے شاگرد ان کا دیوان شائع کرنے کا اہتمام کر رہے ہیں۔ لیکن آج تک وہ بھی شائع نہ ہو سکا اس لئے انتخاب شائع کرنے کا خیال ان کے ذہن میں اُبھرا۔ اس انتخاب میں صفی کی ایک نادر تصویر کا بھی عکس بھی ہے۔ یہ تصویر صفی نے جناب خالدی کو دی تھی۔ تصویر پر صفی کے دستخط تحریر کے ساتھ موجود ہیں "خاص عزیزی ابوالنصر محمد خالدی صاحب کے لئے"۔ دستخط کے نیچے تاریخ ۱۳۵۱ھ (اکیاون ہجری) ہے۔ یعنی صفی اس وقت اکتالیس سال کے تھے۔

پراگندہ:۔ "انتخاب کلام صفی اورنگ آبادی" کی طباعت کے دو سال بعد بھی اور انتقال صفی کے گیارہ سال بعد ۱۹۶۵ء میں "پراگندہ" کے نام سے دیوان صفی کی اشاعت عمل میں آئی جسے صفی کے شاگرد جناب خواجہ حسین شریف شوق نے "ادبستانِ صفی" کی جانب سے مرتب کر کے شائع کیا۔ جب پراگندہ کی طباعت کا اعلان ہوا تو شائقین اور دلدادگانِ کلام صفی کے لئے مژدہ جانفزا سے کم نہ تھا۔ جناب شوق کا اس طباعتِ دیوان سے وابستہ ہونا ہی اس کا ہر حیثیت سے مکمل ہونے کا ضامن تھا بہتوں کو یقین تھا کہ وہی "پراگندہ" مرتب کردہ صفی مزید اضافہ غزلیات اور دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ زیورِ طبع سے آراستہ ہوگا جس کا ذکر مرقع سخن میں ہے اور جناب رفعت نے بھی اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا تھا لیکن جب "پراگندہ" ہاتھوں میں آیا تو یقین کرنے کو جی نہ چاہا کہ جناب صفی جیسے پرگو استادِ سخن کا یہ مکمل کلام ہے۔

"پراگندہ" میں تقریباً دو سو آٹھ ۲۰۸ غزلیں ہیں اور اشعار کی تعداد ۱۵۸۴ ہوئی

اگر متفرقات کے چار سو دس اشعار ملائیں تو کل اشعار کی تعداد (۱۹۹۴) تک پہنچتی ہے۔ اس دیوان میں سنتیس رباعیات اور صرف چار قطعات ہیں صفی کی ایک روایتی تصویر کا عکس بھی دستخط کے ساتھ شامل ہے تصویر کے نیچے یہ شعر لکھا گیا ہے ؎

یہ پراگندہ ہے جو کچھ بھی غنیمت ہے صفی　　میں غریب آدمی دیوان کہاں سے لاؤں

مرقع سخن اور جناب رفعت کی روایت تو یہ ہے کہ صفی نے پراگندہ کے نام سے اپنا ایک دیوان مرتب کر لیا تھا اور اس دیوان کی ترتیب کے بعد مزید انیس سال تک بقید حیات رہے جب تک زندہ رہے اپنا تازہ کلام درج دیوان کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس طویل مدت میں پرانی غزلوں کو چھوڑ کر تازہ بہ تازہ کہی ہوئی غزلوں کا بڑا ذخیرہ شعری صفی کے پراگندہ میں ہوگا۔ جناب شوق نے لکھا ہے کہ "مقبول خاص و عام شاعر کی یادگار فقط یہی ایک مجموعہ کلام ہے جو اتفاقاً دست برد زمانہ سے محفوظ رہ گیا اور جو حسب خواہش مرحوم ہدیہ ناظرین ہے۔"

جناب شوق کا بیان ہے کہ "سب سے بڑا ناقابل تلافی ادبی نقصان یہ ہوا کہ ایک ضخیم مجموعہ کلام آج سے بیس چوبیس سال پہلے چوری ہو گیا۔ کچھ اس وقت کے تلامذہ و متوسلین سے پوچھ کر اور کچھ اپنے حافظے کی مدد سے اکثر نا تمام غزلیں اور نامکمل شعر از سر نو قلمبند کئے۔"

واقعہ کچھ بھی ہو اہل ذوق اور قدر دانان سخن نے "پراگندہ" کو غنیمت جانا اور خواجہ شوق کے شکر گزار ہوئے کہ نامساعدت حالات میں ان کی دلچسپی سے یہ دیوان شائع ہو سکا جب کہ ان کے پُر خلوص استاد بھائی حبیب لسین یاس اور عبدالحمید خاں خیالی کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ جن کا تعاون عمل وقتاً فوقتاً شوق صاحب کو حاصل تھا۔

آخر کار میر اعظم علی صاحب مالک نیشنل بک ڈپو حیدرآباد نے زر کثیر صرف کر کے اس کی طباعت کا انتظام کیا۔ یہ صفی سے ان کی عقیدت مندی کا ثبوت ہے کہ جو

کام لاتعداد شاگردوں اور بے شمار پرستارانِ صفی کسے نہ ہوسکا، انہوں نے کر دکھایا!

فردوسِ صفی: — جناب خواجہ شوق کے ترتیب دیئے ہوئے "پراگندہ" کے تین سال بعد اور صفی کے انتقال کے چودہ سال بعد کراچی (پاکستان) سے صفی کا دیوان "فردوس صفی" کے نام سے سنہ ۱۹۶۸ء میں ادارہ اشاعت ادب کراچی سے شائع ہوکر حیدر آباد پہونچا۔ کتابت وطباعت دیدہ زیب ہے اور کاغذ عمدہ ہے۔ اس دیوان کے مرتب جناب ابو الخیل سید غوث یقین ہیں جواب مرحوم ہوچکے ہیں۔ جناب یقین صفی کے ایک قدیم شاگرد تھے "آپ سے ملیئے" کے عنوان سے ابتداء میں سینتالیس صفحات پر مشتمل ایک تعارف نامہ ہے جس میں صفی کے حالات زندگی کے ساتھ ان کی شاعری اور کمالِ فن پر معلوماتی تبصرہ کیا گیا ہے۔ کلام حروف تہجی کی ترتیب سے ردیف وار (۲۵۳) صفحات پر شائع ہوا ہے۔ سب سے خاص بات یہ کہ جس طرح صفی لکھتے وقت صحتِ لفظی اور صحیح رسم الخط کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اسی طرح جناب یقین نے ردیف وار غزلوں کے اندراج میں اپنے اُستاد کا اتباع کرتے ہوئے صحتِ لفظی کا بڑا خیال رکھا ہے۔ دوسری قابل تعریف اور کام کی بات جناب یقین نے یہ کی کہ جن اشعار میں ضرب المثل اور محاورات آئے ہیں ان کو واوین میں نمایاں کردیا ہے تاکہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صفی نے ضرب المثل اور محاورات چاہے وہ اُردو کے ہوں یا فارسی کے اپنے اشعار میں حسن وخوبی سے برتتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ضرب المثل صرف ان ہی کے شعر کے لئے وضع ہوئی ہیں۔

فردوسِ صفی میں غزلیات کی تعداد (۱۴۳) اور اشعار (۲۰۵۸) ہیں "نذرگل" کے عنوان سے (۳۷۲) متفرق اشعار ہیں۔ اس طرح فردوس صفی میں جملہ اشعار کی تعداد تقریباً (۲۴۳۰) ہوتی ہے۔ فردوس صفی میں صرف چھ رباعیات زیب دیوان ہیں۔ فردوس صفی میں جناب شوق کے مرتب کردہ "پراگندہ" سے (۱۴۴۰) اشعار زیادہ

ہیں۔ فردوسِ صفی میں صفیؔ کے دستخط کے ساتھ ایسی ہی تصویر ہے جو "پراگندہ" میں نظر آتی ہے۔

فردوسِ صفیؔ کے شروع میں جناب یقینؔ نے "ضروری بات" کے عنوان سے چند اہم چونکا دینے والی باتیں کہی ہیں۔ فرماتے ہیں "بزم تلامذہ صفیؔ" (جس کے دستوری سرپرست حضرت ممدوح تھے) سے راہِ فرار اختیار کرکے چند اراکین "بزم تلامذہ صفیؔ" نے اپنی ایک جداگانہ خود ساختہ بزمِ ادبستانِ قائم کی اور اس بزم کی طرف سے نومبر ۱۹۶۵ء کو اُستادی مرحوم کا غیر مصدقہ اور غیر مطبوعہ کلام "پراگندہ" کے نام سے شائع کیا۔

میرے علم میں نہیں ہے کہ تلامذہ صفیؔ یا جناب خواجہ شوقؔ کی جانب سے جناب یقینؔ کے اس الزام کا کوئی جواب بھی دیا گیا ہے۔ اس بارے میں جو واقعات سُننے میں آئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب صفیؔ کے شاگردوں میں شروع سے نااتفاقیاں رہیں اور آج بھی ہیں۔ جناب رفعتؔ نے انتخاب کلام صفیؔ اورنگ آبادی شائع کیا تو جناب خواجہ شوقؔ نے اس پر یہ ریمارک کیا کہ ناموزوں "انتخاب کلام صفیؔ" سے مرحوم کی روح کو دانستہ بہرحال دھکا لگا ہے۔ جناب یقینؔ بھی جناب شوقؔ کے مرتب و شائع کردہ "پراگندہ" کو غیر مصدقہ بتلاتے ہیں۔ مزید یہ کہ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب بعض شاگردانِ صفیؔ نے جناب یقینؔ کے شائع کردہ فردوسِ صفیؔ کے کلام کو غیر مصدقہ بتایا اور جناب یقینؔ پر حذف و تصرف کا الزام عائد کیا ہے ع خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا کہئے!

ہم نے اپنی تفریحِ طبع کی خاطر "پراگندہ" اور "فردوسِ صفیؔ" کے ہم قافیہ و ردیف غزلوں کا مقابلہ کیا تو بعض اشعار میں مختلف نوعیت کا اختلاف نمایاں پایا۔

(لفظی اختلاف)

پراگندہ	فردوسِ صفیؔ
جب اس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا	"پھر اس نے وعدہ کیا میں نے انتظار کیا
زباں پر نہیں صورت پہ اعتبار کیا	زباں پر نہیں صورت پہ اعتبار کیا

مصرعہ میں اختلاف :-

محبت سے نہ دیکھو تم تو دشمن کی نظر دیکھو
خفا ہو کر، بگڑ کر روٹھ کر دیکھو مگر دیکھو

نہ دیکھو دوست بن کر تم تو دشمن کی نظر دیکھو
خفا ہو کر، بگڑ کر، روٹھ کر دیکھو مگر دیکھو

پورے شعر میں اختلاف :-

گھٹا گھنگھور چھائے خوب گرجے ٹوٹ کر برسے
مرے اللہ وہ جانے نہ پائیں اب مرے گھر سے

وہ آئے ہیں تو بس جانے نہ پائیں اب مرے گھر سے
الٰہی گھر کے آئے خوب گرجے ٹوٹ کر برسے

کہیں مقطع کہیں شعر :-

ضعف مجھ کو بھی ہے اک آدھ خوراک اے ساقی
یہ جو شیشوں میں ہے سب اس کو دوا کہتے ہیں

ایک خوراک صفی ضعف میں ہے اے ساقی
یہ جو شیشوں میں ہے سب اس کو دوا کہتے ہیں

مقطع میں لفظی اختلاف :-

صفی اور دل دے پھر اس سادگی سے
یہ سب ذات حضرت کی عیاریاں ہیں

صفی اور دل دیں حسینوں کو تو یہ
اجی سب یہ حضرت کی مکاریاں ہیں

اس طرح کے اختلافات دو ایک جگہ نہیں بلکہ کم و بیش دو سو پچاس اشعار ملتے ہیں۔

اب کیوں ہے اس پر غور کرتے رہیے!

غیر مطبوعہ کلیاتِ صفی :- صفی کے دور متوسط کے شاگردوں میں جناب شمس الدین تاباں سر فہرست ہیں۔ جناب تاباں نے اپنے ذوق اور اس جذبہ عقیدت مندی کی وجہ جوان کو اپنے استاد صفی سے تھا جناب صفی کا بہت سارا کلام اپنی ذاتی تلاش و جستجو سے جمع کیا۔ انہوں نے اس کلام کو ایک ضخیم دیوان کی صورت میں مرتب کیا۔ ان کی بڑی آرزو اور خواہش تھی کہ یہ دیوان کلیاتِ صفی کے نام سے شائع کریں ان کی قائم کردہ انجمن ادبستانِ دکن جس کے وہ معتمد بھی تھے اس کلیات کو طبع و شائع کرنے کی تحریک بھی منظور کی تھی اس عرصہ میں وہ بیمار ہو گئے اور بیماری نے طول کھینچا۔ لیکن اس کے باوجود جناب تاباں اس دیوان کی طباعت کے لئے وہ سب کیا جو ان کے بس میں تھا۔

انہوں نے کیا کیا اور کن کن لوگوں سے ملے اور کیا کیا اس راہ میں دشواریاں اور مایوسیاں ان کو درپیش ہوئیں ایک لمبی داستان ہے الحاصل عدم فراہمی سرمایہ اس کلیات صفی کی طباعت میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئی۔ پھر انہیں کھا جانے والی بیماری اور معاشی مسائل نے انہیں حیات و موت کے دوراہے پر لاکھڑا کر دیا۔ آخر بعد حسرت و یاس وہ یہ آرزو لے کر دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

لیکن پدر اگر نہ تواند پسر تمام کند کے مصداق جناب تاباںؔ کے جواں سال فرزند رؤف رحیم یم۔اے (عثمانیہ) نے اپنے والد مرحوم کی خواہش کے احترام میں اس دیوان کی طباعت کا بیڑہ اٹھایا رؤف رحیم صاحب باذوق شاعر ہیں اور سخن فہم بھی۔ لیکن اتنے بڑے کلیات صفی کو شائع کرنے سرمایہ کا سوال باقی رہا۔ رؤف رحیم کی ساری دوڑ دھوپ رائیگاں گئی۔ دکن کے اس عظیم غزل گو شاعر کے کلیات کو شائع کرنے دکن کے لاتعداد انجمنیں یا ادارے مالی تعاون کرنے سے قاصر رہے۔ آخر کار حسامی بک ڈپو کے مالکین اس کلیاتِ صفی کا انتخاب چھاپنے راضی ہوئے مگر اس شرط کے ساتھ کہ یہ انتخاب پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم کریں۔

گلزارِ صفی :۔ جناب صفی کا تیسرا دیوان گلزارِ صفی کے نام سے سنہ ۱۹۸۷ء کے اوائل میں شائع ہو گیا۔ اس کے مرتب رؤف رحیم ہیں اور ناشر حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدر آباد حُسنِ انتخاب ڈاکٹر مغنی تبسم کا رہینِ منّت ہے۔

گلزارِ صفی میں کل ایک سو چونسٹھ غزلیات ہیں۔ بعض ایسے اشعار ہیں جو پراگندہ اور فردوس صفی میں موجود نہیں ہیں مرتب رؤف رحیم نے "عرضِ مرتب" میں لکھا ہے کہ "مابقی غزلیات، نظمیں، رباعیات اور قطعات کو انشاء اللہ تعالیٰ "گلزارِ صفی جلد دوم" میں شامل کیا جائے گا۔"

اس طرح گلزارِ صفی بھی جناب صفی کے کلام کا تیسرا انتخاب ہے۔ جو صرف تہجی سے دیوان کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ کاغذ اچھا ہے۔ لکھائی و چھپوائی اچھی ہے۔

"غیر مطبوعہ کلیاتِ صفی" کا دوسرے مطبوعہ دیوانوں کی غزلیات سے تقابل کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صفی جیسے پُرگو شاعر اور اُستادِ سخن کا کتنا کم کلام اب تک شائع ہوا ہے اور

اشعار کا ایک معتد بہ حصّہ محروم اشاعت ہے۔

"وہاں جانے کو مکڑی اور انڈے کو کبوتر ہے"

پراگندہ ۱۹ شعر

فردوس صفی ۲۷ شعر

گلزار صفی ۱۴ شعر

غیر مطبوعہ کلیات صفی ۶۴ شعر

"صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے"

پراگندہ ۱۵ شعر

فردوس صفی ۳۵ شعر

گلزار صفی ۲۱ شعر

غیر مطبوعہ کلیات ۱۱۳ شعر

"خدا نے دی ہیں آنکھیں دیکھنے ہی کو مگر دیکھو"

پراگندہ ۱۵ شعر

فردوس صفی ۲۰ شعر

گلزار صفی ۲۸ شعر

غیر مطبوعہ کلیات ۳۲ شعر

"اگر قائم محبّت کی کوئی میعاد ہو جائے"

پراگندہ ۹ شعر

فردوس صفی ۱۸ شعر

گلزار صفی ۷ شعر

غیر مطبوعہ کلیات ۶۳ شعر

"فیصلہ کر دیا تو ارمان دلِ مضطر نکال"

پراگندہ ۷ شعر

فردوسِ صفی ۱۱ شعر

گلزارِ صفی ندارد

غیر مطبوعہ کلیات ۲۰ شعر

"دیر کافر تو مسلمان حرم دیکھتے ہیں"

پراگندہ ۱۲ شعر

فردوسِ صفی ۱۳ شعر

گلزارِ صفی ۱۴ شعر

غیر مطبوعہ کلیات ۳۶ شعر

"کب سے ہوں کیا بتاؤں تلاشِ بہار میں"

پراگندہ ۱۳ شعر

فردوسِ صفی ۳۲ شعر

گلزارِ صفی ۲۵ شعر

غیر مطبوعہ کلیات ۶۶ شعر

بہر حال گلزارِ صفی کے مرتب جناب رؤف رحیم قابلِ صد ستائش ہیں کہ انہوں نے صفی کے کلام کو نہایت عمدگی سے مرتب و شائع کرنے کے لئے بڑی دوڑ دھوپ اور جستجو کی اگرچہ ان کی بڑی مجبوری رہی کہ عدم فراہمی سرمایہ کے باعث ان کے والد جناب تاباں کا جملہ کلام صفی کے چھپنے کا خواب پورا نہ ہو سکا۔ لیکن بڑے خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے گلزارِ صفی کے "عرضِ مرتب" میں وعدہ کیا ہے کہ جناب صفی کے مابقی غزلیات، قطعات، رباعیات وغیرہ گلزارِ صفی جلد دوم میں مرتب و شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اصلاحیں

صفیؔ اورنگ آبادی غزل کے بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ بڑے سخن فہم استادِ سخن بھی تھے۔ طبیعت میں سادگی ایسی تھی کہ بڑی خوشی اور دلچسپی سے اصلاح کیلئے مستعد رہتے تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ خود اپنے ہاتھ سے شاگرد کے شعر پر اصلاح دیتے تھے اور اکثر اصلاح کی وجوہ لکھتے اور سقم و خوبی کا فرق بتاتے۔ زبان، بول چال اور روزمرہ کے صحیح استعمال پر متوجہ کرتے۔ قواعد اردو کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اچھے شعر کی تحریراً داد دے کر ہمت افزائی کرتے۔ اگر شعر میں سراپا سقم ہوتا تو اسے قلم زد کردیتے مگر وجوع ضرور لکھتے۔

جناب نظیر علی صاحب عدیلؔ نے سب رس یادگار صفیؔ نمبر مارچ ۱۹۵۶ء میں شاگردوں کی تعداد چار سو دس بتائی ہے۔ لیکن ہم چند شاگردوں کے کلام پر دی گئی اصلاحیں لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر شاگردوں کے کلام پر جناب صفیؔ کی اصلاحیں یکجا کرکے مرتب و شائع کیا جائے تو یقیناً اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

(۱) پیرزادہ جاوید قادری ایم۔اے بی ایڈ۔ ڈی آئی ایڈیٹر "ارشاد" ۲۵-۱-۱۹۶۶ء

اشعار	اصلاح
آج تک بھی یونہی انسان کی بسر ہوتی ہے	یوں ہی انسان کی اوقات بسر ہوتی ہے
زیست اک سلسلۂ شام و سحر ہوتی ہے	("یوں ہی" و "نہ" تا کسی طرح درست نہیں)
یاد آجاتے ہیں اک دم وہ پرانے قصے	(قصے کی بجائے دکھڑے۔ قصہ غم کا بھی ہوتا
تری تصویر کبھی بارِ نظر ہوتی ہے	ہے اور خوشی کا بھی)
چشم مضطر میں رہے اشک نہ گرنے پائے	(اشک محفوظ ہیں جبتک ہے مری آنکھ میں بند مھی
بند سیپی ہی میں تکمیلِ گہر ہوتی ہے	ظرف مضطر ہو تو مظروب کو قرار کیسا)

رنج و حسرت سے بھائی چارہ ہے
زندگی کو بڑا سہارا ہے

رنج و غم سے جو بھائی چارہ ہے
(حسرت کا استعمال بالتانیث ہوا کرتا ہے
اور بھائی چارا جہاں بھی جتایا جاتا ہے.
وہاں مذکور ہی مذکور، مذکور ہوا کرتے ہیں)

دستبرد برق سے جو بچ رہا تھا وائے حیف
شاخ سے گرتا ہوا وہ آشیاں دیکھا کئے

آسماں سے ٹوٹتے تارے پہ کیا حیرت انہیں
شاخ سے گرتا ہوا جو آشیاں دیکھا کئے
(نئی پود کے خیال سے اونچا ہے)

آنکھیں دکھلا کے مسکراتا ہے
مار کے پھر جلا رہا ہے کوئی

روٹھ کر مسکرا رہا ہے کوئی (مطلع)
....

ایک دو جام اور دے ساقی
ابھی کچھ ہوشیار ہیں ہم لوگ

ابھی جلسہ نہ ختم کر ساقی
....

(ایک دو جام ایک ہی کے لیے کافی نہیں
ہو سکتے چہ جائے کہ "لوگ" اس لئے "جلسہ")

ہو گیا اپنا جگر ہی پارہ چاک
یہ ہماری آہ کی تاثیر ہے

اور یہ ہم ہو چکے وہ دیکھئے۔
....

(دیکھئے کا لفظ دونوں مصرعوں میں
شامل الطرفین ہو کر بڑا مزہ دے رہا ہے)

(۲) میر بہادر علی جوہر

تسکین دل کے سینکڑوں اسباب ہیں مگر
ہر اک سکون باعثِ صد اضطراب ہے

تھم تھم کے بڑھتی جاتی ہیں بے تابیاں مری
....

وہ ہم سے کیا پھرے کہ زمانہ ہی پھر گیا
اے انقلابِ دہر یہ کیا انقلاب ہے

کچھ اس سے شکوہ سنج ہے قلب حزیں مرا
....

اشعار	اصلاح
دونوں جہاں کے جلوے نگاہوں میں ہیچ ہیں	صورت کچھ اپنے جینے کی آتی نہیں نظر
آئی ہے جب سے آپ کی صورت نظر مجھے	....
آپ کی چشمِ عنایت ہے تو مجھ کو فکر کیا	....
یہ اگر چاہیں تو ہر مشکل مجھے آسان ہے	آپ اگر چاہیں تو
آدمی کو چاہیئے اس بات کا ہر دم خیال	آدمی کو چاہیئے کچھ آدمیت کا خیال
آدمیت سے جہاں میں آدمی کی شان ہے	....
مجھ سے تم کیا پوچھتے ہو باعثِ حیرت ہے کیا	
چشمِ حیرت ہی سے پوچھو کس لئے حیران ہے	
ساقی کے دستِ خاص سے پایا ہے ایک جام	ساقی کے لُطفِ خاص کی تاثیر دیکھ لی
بس آج میں نے پی لیا اس نے پلا دیا	اک جام میں نے
تم سے بڑھ کر تو نہیں ہے مجھکو کوئی شئے عزیز	جاں نثاروں سے کیا کرتے ہو کیوں دل کی طلب
دل کی ہستی کیا ہے تم پر جان بھی قربان ہے	....
کسی کی مست نگاہیں ارے معاذ اللہ	تمہاری چشمِ تغافل ارے خدا کی پناہ
ستم ہے دل کے لئے تو بلا ہے جان کیلئے	....
	(معاذ اللہ میں ایک مفہوم تنفر کا بھی نکلتا ہے جس کو معنی سے کوئی تعلق نہیں)
دل، جگر میں نہیں ایک خون کا قطرہ	محبت کی آگ بھڑکی ہے
کہاں سے آئے لہو چشمِ خوں فشاں کیلئے	....
ہلا دوں عرش کے پائے بساط کیا اسکی	فغانِ بے کس و مظلوم سے بچائے خدا
بہت ہے ایک مری آہ آسماں کیلئے	(آپ کا مصرعہ غلط نہ تھا)
قفس میں دخل جو صیاد کا نہیں ہوتا	خوف
یہاں بھی ڈالتے ہم طرح آشیاں کیلئے	.... (دخل ہو بلا سے مگر خوف نہ ہو)

جو ہر عبث ہے صنعتِ خالق پہ اعتراض	جو ہر عبث ہے رنگِ زمانہ پہ اعتراض
دُنیا کو کیوں بُرا کہیں دُنیا میں آکے ہم	....
بد دُعا نکلے یا دُعا نکلے	....
تم ہی کہدو کہ دل سے کیا نکلے	تم کہو دل دکھے
آبرو رکھ لی آنسوؤں نے مری	اپنے دامن میں لے لئے اُس نے
یہ دُرِ اشک بے بہا نکلے	....
اظہارِ مدعا کوئی مشکل نہیں مگر	..........کے تو لاکھوں طریق ہیں
سُن کر کوئی ہنسی میں اڑائے تو کیا کروں	لیکن ....
دل سے بھُلا دیا تو ہے دُنیا جہان کو	مجھ کو بھی بار بار ترا بنا ہی چاہیئے۔
یادان کی بار بار جو آئے تو کیا کروں	....
ہے سخت امتحان کہ توبہ کے بعد بھی	اللہ توبہ توبہ جو ....
اصرار کر کے کوئی پلائے تو کیا کروں	مجبور ....

(۳) یوسف علی خلوص

کیا مصیبت ہے ان کی محفل میں	کیا قیامت ہے ....
آشنا آشنا نہیں ہوتا	....
جو وہ ماہ وش گھر سے نکلا کرے گا	جو وہ حور وش ....
مَلک اپنی آنکھیں بچھایا کریں گے	....
چل دیئے چھوڑ کے وہ مجھ کو یہ قسمت میری	....
روکنے کا کوئی حیلہ نہ مجھے یاد آیا	کوئی چلتا ہوا فقرہ نہ مجھے یاد آیا
میں وابستۂ دامن ہوں مجھے بھول گئے	....
آپ نے یاد کیا مجھکو میں کب یاد آیا	آپ نے غور کیا سوچ لیا یاد آیا۔

اصل	اصلاح
کسی دن دیکھنے والوں کی تابِ دید دیکھیں گے	کسی دن ہم مذاقِ بلبل و پروانہ دیکھیں گے
نقاب اس کے رخِ رنگیں و روشن سے ذرا سرکے	. . . .
پلانا جی میں ہے تو دورِ ساغر سے ذرا پہلے	تمنائے کرم ہے ذکر کیا پینے پلانے کا
مرے متلوانے ساقی دیکھ لے مجھکو نظر بھر کے	. . . .
نہیں ہے چاہنے والوں کی خیر اے قاتل	. . . . بوالہوس . . . . . .
لگا ہے منھ کو تری تیغ کے لہو میرا	. . . .
پھر کیوں یہ جلائے کہ جلتی ہے رات بھر	کیا کیا جلی کٹی نہ سنائی تمام رات
پروانہ شمع سے ہے مقرر جلا ہوا	. . . .
نہ پوچھو بے گناہوں کی گنہ گار اپنا غم بھولیں	نکوکار اپنا تقویٰ تو گنہ گار اپنا غم بھولیں
جو تم آؤ اس صورت سے میدانِ قیامت میں	. . . .
ترا لطف و کرم اغیار کو جور و ستم ہم کو	پڑھے فرہاد و مجنوں کے فسانے اور یہ سمجھے
لیاقت کے موافق آدمی کو کام ملتا ہے	. . . .
وفاداری کے بدلے داغِ دل داغِ جگر پایا	اٹھا کر ہم نے صدمے درہم داغِ جگر پایا
جو اچھا کام کرتا ہے اسے انعام ملتا ہے	. . . .

(۴) غلام علی حاوی

اصل	اصلاح
واقف ہو کون آپ کی اس رسم و راہ سے	حیران ہوں حضور کی اس رسم و راہ سے
دل سے قریب دور ہیں میری نگاہ سے	نزدیک دل سے دور ہیں مری نگاہ سے
	(نزدیک و دور - قرب و بعید)
دنیا کا خون اور زمانے کا دل بھی دیکھ	دنیا کا خون دیکھ ! ہمارا نصیب دیکھ
لیتے ہیں کیا مراد سفید و سیاہ سے	واقف اگر نہیں ہے سفید و سیاہ سے
کرتوت نفس کے ہیں یہ دھوکے ضمیر کے	دربان کا اثر ہو بھلا گھر کے بھید پہ
پوشیدہ گھر کا بھید ہے سب کی نگاہ میں	پوشیدہ ہیں ضمیر کے دھوکے نگاہ سے

یہ تری آنکھ بھی ہے بلا کی نظر فریب ....
کس کس کو دیکھتا ہوں تجھے دیکھتا ہوا | کس کس کو دیکھتا ہوں اسے دیکھتا ہوا۔

قصیدہ، قطعۂ تاریخ، نظم تہنیت، سہرہ ....
یہ سب ہیں منحصر شادی پہ ان پر منحصر شادی | یہ سب ہیں منحصر شادی پہ ان پر منحصر شادی؛

(اصلاح صرف مصرع آخر پہ علامت استفہام)

یہ کیسی بات ہے اللہ والوں کی زبانوں پر | ہے ایسی بات صرف اللہ والوں کی زبانوں میں
اتر جاتی ہے دل میں جب وہ پڑ جاتی ہے کانوں میں ....

سرمایہ دار دردِ محبت بنا ہے دل ....
مفلس جو تھا وہ صاحبِ مقدور ہو گیا | اب یہ غریب صاحبِ مقدور ہو گیا

(۵) (محمد وقار الدین صدیقی وقار)

شش جہت سے تری آواز مجھے آتی ہے | ...... چلی ......
کتنی راہوں سے بہ یک وقت گذرنا ہے مجھے ....

(بیک وقت کے معنی کا اضافہ ہوا)

یہ نہ پوچھو کیا دیکھا یہ نہ پوچھو کیا پایا | ...... دیکھو ......
مری خود فراموشی حاصل نظارہ ہے ....

("پوچھو" کی تکرار کی گرانی رفع ہوئی۔ بہتر "حاصل" پوچھنے سے زیادہ غور و تامل کی چیز ہے)

تھی گونا انکساری اور اسے ہم بندگی سمجھے
نہ سمجھی بندگی ہی جب خدائی کیا کوئی سمجھے

یہ غزل دکھا کر جب میں لوٹا تو کچھ ہی دیر میں برادرم جناب نظیر علی صاحب عدیل استاد محترم کی لکھی ہوئی چٹھی لے آئے۔ لکھا تھا "انکساری" صحیح ہے یا آپ کی بہر طور غلط "انکسار" خود ہی مصدر ہے اس پر یائے مصدری نادرست ہے۔

اِس انتباہ کے بعد میں نے مصرع بدل کر مطلع اِس طرح لکھ لیا۔

خُدا سے خاکساری تھی جسے ہم بندگی سمجھے
نہ سمجھی بندگی ہی جب خدائی کیا کوئی سمجھے — وقار

(۶) نظیر علی عدیل

وعدہ تو ہے کہ خواب میں آئیں گے وہ عدیل ....
مجھ کو خوشی میں نیند نہ آئے تو کیا کروں — مارے خوشی کے ....

(خوشی کے مارے" محاورہ ہے اور جہاں شعر میں محاورہ کی گنجائش ہو تو ضرور استفادہ کیجئے۔ صفی)

یوں نظر آرہا ہے جنت میں — کیا کروں آرزوئے خلد عدیل
جیسے دیکھے ہوئے مناظر ہیں — میرے ....

(جنت کا تعلق مستقبل سے ہے اور "نظر آرہا ہے" کا تعلق زمانہ حال سے ہے۔ ہم واقعاتِ ماضی کو واقعات حال کے طور پر پیش کرسکتے ہیں اس لئے کہ واقعاتِ ماضی وقوع میں آچکے ہیں اور ہمارے علم میں رہتے ہیں۔ لیکن اسی قاعدہ سے مستقبل کو حال بنا لینا نقصِ بیاں کی تعریف میں آتا ہے کیونکہ مستقبل کے حالات ہمارے لئے نامعلوم ہیں)
دوسرا مصرع بہت شگفتہ اور صنعتِ مجاز مرسل کا حامل ہے اس لئے میں شعر کو خارج کرنے کے حق میں نہیں۔ پہلے مصرع کو بدل دیا ہے۔ جس میں نہ صرف آپ کا طنز برقرار ہے بلکہ حسنِ تعلیل بھی پیدا ہوگیا ہے۔ آپ اپنے اصل مقطع کو خارج کرکے اس مقطع کو غزل میں رکھیں۔ صفی)

آدمی جب غم شناسا ہو گیا — خُود ....
مقصدِ تخلیق پورا ہو گیا
....

(غم شناسی محدود ہے اور خود شناسی غیر محدود۔ آپ کا مطلع خود شناسی سے مکمل ہوتا ہے۔ صفی)

دُنیا میں اگر پھر آنا ہو دل لے کے نہیں آئیں گے کبھی .... عدیل

اک بات ہوئی تو سہہ لیں گے ہر بات میں دل آزاری ہے ....

(اچھے شعر لوگوں کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی غلط ناموں سے منسوب کر دئے جاتے ہیں۔ میری رائے میں اگر اس شعر کو مقطع میں بدل دیا جائے تو لوگ اس شعر کے ساتھ ساتھ عدیل کو بھی ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ صفی)

مسلسل وہیں برق گرتی رہی .... جہاں

جہاں میں نشیمن بناتا رہا .... وہیں

(شعر کے موجودہ الفاظ برق کی معرکہ آرائی کے آئینہ دار ہیں اس کی بجائے اگر آپ کا نشیمن بنانے کا عمل آپ کی معرکہ آرائی کے آئینہ دار ہیں اس کی بجائے اگر آپ کا نشیمن بنانے کا عمل آپ کی معرکہ آرائی کا مظہر ہو تو شعر میں نسبتاً زیادہ قوت آجائے گی اور بات قابل ذکر قرار پائیگی۔ خفیف سے ردوبدل سے شعر برق کے مقابلے میں آپ کی معرکہ آرائی کا شاہکار بن گیا ہے۔ تاہم میری نظر میں برق و آشیاں کا مضمون اگر مہمل نہیں تو صرف برائے مضمون ہے کم از کم آپ احتراز کریں تو اچھا ہے۔ صفی)

رہروانِ عدم کو کیا کہئے ....

میں تو بے جان، قصد دور و دراز .... دورِ دراز

(اکثر لوگ دور و دراز کہتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں واؤ عطف کا کیا محل ہے۔ صحیح لفظ دورِ دراز ہے۔ صفی)

کسی کے آتے ہی بدلا ہوا ہے رنگِ چمن .... کہ کس کی سیر سے نکھرا

کھلے وہ پھول کہ پھولوں نہیں سماتے ہیں ....

(یہاں رنگِ چمن کے بدلنے سے زیادہ نکھرنے کا محل ہے۔ اس کے علاوہ پہلا مصرع بیانیہ ہے۔ اگر سوالیہ ہو تو شعر مزید حسن کا حامل ہو گا۔ صفی)

دل نہ دھڑکے تو زندگی کب ہے .... بھی نہیں
زندگی ہے تو بے قراری ہے ....

(اس غزل میں "ہے" ردیف ہے اور بے قراری۔ گزاری۔ خاکساری وغیرہ قافیے۔ پہلے مصرع کے آخر میں "ہے" کے استعمال سے ترادف ردیفیں ہوتا ہے جو ناجائز اور متروک ہے اس میں شک نہیں کہ بعض متقدمین اور اس دور کے بعض کہنہ مشق اور نامور شعراء کے پاس بھی ترادف ردیفین کی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ کوئی جواز نہیں۔ جب ایک بار قواعد مرتب ہو چکے اور ترادف ردیفیں کو متروک قرار دے دیا گیا تو اس کی پابندی ہونی ہی چاہیئے۔ آپ کا شعر اصلاح سے فطری آمد اور حقیقت آفرینی کا حامل تھا اور اب اصلاح کے بعد بے عیب بھی ہو گیا۔ صفی)

ساتھ ہے حسن و عشق کا مشکل ....
ایک ہوں کیسے شیشہ و آہن ایک نہ ہوں گے ....

(آپ نے غالباً یہ شعر جگر مرادآبادی کے اس شعر کو پیش نظر رکھ کر کہا ہے ؎
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے عشق ہے کار شیشہ و آہن۔
آپ کا شعر خوب ہے اور آپ استخراج میں پورے کامیاب ہیں۔ اب کے جگر آئیں تو انہیں سنائیے اور داد لیجئے۔ صفی)

(۷) غلام محبوب خاں مسلم

جیب و دامن تو جب سئے ہوتے دامن و جیب کو سئے ہوتے
ہوش میں اپنے آ لئے ہوتے ہوش میں ہم تو آ لیئے ہوتے

ضمیر ہم تو

چرکے پر چرکے گر دیئے ہوتے داغ پر داغ گر دیئے ہوتے
لطف جی بھر کے لے لئے ہوتے آپ بھی لطف لے لئے ہوتے

اِتنا معروضہ دل کا ہے یارب	یا خدا جتنی میری ہمت تھی
جتنی ہمت دی غم دیئے ہوتے	غم بھی اتنے مجھے دیئے ہوتے
دِل کی مٹی تباہ کیوں ہوتی	. . . .
تم جو اپنا بنا لیئے ہوتے	کام اپنے بنا لئے ہوتے
اتنا وحشی نہ ہوتا وحشت سے	. . . .
دل کو گیسو جکڑ لیئے ہوتے	سیکڑوں دل جکڑ لئے ہوتے
ہاتھ کیوں کٹے نامہ بر ترے	نامہ بر ترے ہاتھ کیوں کٹتے
پائوں گران کے پڑ لئے ہوتے	. . . .
رو کے کہتا کسی کا لاشے پر	لاش پر میری اس نے رو کے کہا
ہم مرے ہوتے تم جیئے ہوتے	. . . .
تنہا جینے میں کیا مزا مسلم	غم سے چھٹنے کو حضرتِ مسلم
دِل دئے جان بھی دئے ہوتے	جان ہی دے کے چل دیئے ہوتے
(۲) سُناؤں تمہیں کیا بیانِ محبت	تمہیں کیا سناؤں بیانِ محبت
مرا سر ہے اور آستانِ محبت	. . . .
سنائیں کیسے ماجرائے شبِ غم	سُناؤں . . . .
بنائیں کیسے رازدانِ محبت	بناؤں . . . .
صفت ہے تری دین و ایمان کی خواہاں	تری ہر صفت . . . .
تری ذات روحِ روانِ محبت	. . . .
تپش حُسن کی تم پتنگے سے پوچھو	لگی . . . .
سنو شمع سے داستانِ محبت	. . . .
(۳) دُنیا ہے جو بھی دیدے اسکی نام ہے ترا	لایا ہوں آرزو میں پہاڑی شریف پر
آیا ہوں بارگاہِ فلک اشتباہ میں	. . . . ولایت پناہ میں

(۴) اے بے کسیٔ عشق تو رکھی مری شرم ولاج قاتل کا نام لیتے ہوئے شرم کیوں نہ آئے
مارا ہوا ہوں میں نگہ سشرمسار... کا
. . . .
(شرم فارسی اور لاج اردو دونوں میں واؤ (و) فارسی عطف کا)

(۵) عارض جاناں پہ زلف عنبری لہراگئی روئے روشن پر تری زلف سیہ لہرا گئی
یا سحر کے ساتھ مری شام غم بھی آگئی
. . . .
(لفظ عنبری نہیں عنبریں ہے اور اس میں ی۔ن (ین) حرف نسبت۔ جیسا
نمک سے نمکیں زلف کو عنبریں سیاہی کے اعتبار سے نہیں بلکہ خوش بو سے
کہا کرتے ہیں اور یہاں "شام غم" سے مثال مقصود ہے اس لئے عنبریں سے سیہ بہتر)

(۶) مشوروں پر عدو کے عامل تھے
وہ کہے پر . . . .
دشمن عاشقانِ کامل تھے
. . . .
("عامل" کا لفظ کسی نہ کسی ضمیر کو چاہتا ہے)

(۷) لاکھوں نالوں سے فائدہ اے دل
. . . .
ایک ہی نکلے کام کا نکلے
ایک بس ہے جو . . . .
(لاکھ عدد اور معدود دونوں کا جمع ہونا ضروری نہیں جیسے وہاں ہزارہا
آدمی تھا یا ان کو لاکھ روپیوں کی ضرورت ہے)

(۸) میں اس کو پا رہا ہوں اپنے گھر میں نہیں غفلت سے خالی اہل دنیا
یہ بیداری ہے یا خواب گراں ہے
. . . .
ہے دل میں جاگزیں اک یاد تری تری ہی یاد ہے خاطر نشین اب
ترا ہی نام اب ورد زباں ہے
. . . .
ستم کے شکوے پر اس نے یہ پوچھا کیا شکوہ تو اس نے مجھ سے پوچھا
محبت میں عداوت کا گماں ہے تمہیں ہم سے . . . .

(۹) تجھے دُنیا کہے گی کیسے مسلم
جو دِل کو اپنے بت خانہ بنا دے
تجھے مسلم کہے گا کون مسلم
جو اپنے دل کو بُت خانہ بنا دے

(۱۰) خیرات نے کر دیا آجر ثواب کا
کتنا کرم گدا نے کیا بادشاہ کا
مستحق اجر کر دیا ....

....

تنقیدیں

صفی کا شعر ہے ؎

صفی اُستاد بننا ہے تو اُستادانِ عالم کی
اُٹھاؤ جوتیاں تازہ کرو حقے، بھرو چلمیں

صفی نے اپنے اساتذہ سخن ضیا گورگانی، ظہور دہلوی، فروغ حیدر آبادی، اور کیفی حیدر آبادی کی خدمت میں یکے بعد دگرے حاضر ہو کر اپنے کلام کی اِصلاح لی اور فن شعر کے رموز سے آگاہی حاصل کی۔ ان کے پہلے اُستاد ضیاء گورگانی شہزادگان دلی سے تھے اس لئے وہ اہلِ زبان تھے۔ فن عروض میں جو اُستادانہ عبور تھا اس کا ثبوت ان کی کتاب "تحقیقاتِ ضیاء" سے ملتا ہے۔ دوسرے اُستاد بھی بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ صفی نے اپنے اساتذہ سے کسبِ ہنر ضرور کیا لیکن اُستاد کے آگے زانوئے ادب طے کرنے سے بڑھ کر خود ان کی خداداد صلاحیت، فکری ذہانت اور شوقِ مطالعہ نے ان کو کندن بنایا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ شاگرد کو کسب فن میں اس کی اپنی ذاتی دلچسپی اور ذہانت کو بڑا دخل ہے ؎

ہر ہنر خدمتِ اُستاد سے آتا ہے صفی
لیکن اس بات میں شاگرد بھی اُستاد رہے

چنانچہ صفی اپنے اس شعر کی تصویر تھے۔ وہ غزل کے نہ صرف بلند رتبہ خوش گو شاعر تھے بلکہ فن شاعری میں امام الفن بھی تھے۔ وہ شمالی ہند میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے زبان داں نہ تھے۔ جیسا کہ قاعدہ کلیہ بنا دیا گیا ہے۔ لیکن دکن میں ایسے باکمال تنقید نگار پیدا ہوئے جنھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ زبان دانی کسی طبقہ یا مقام تک محدود نہیں ہے۔ صفی کو اپنی زبان دانی پر بھروسہ تھا ؎

اہل زباں نہیں ہوں نہ باں داں ہوں اے صفی
رُتبہ مرا زیادہ ہے اور اعتبار کم

ان کا سارا کلام ان کے دعویٰ کا شاہد ہے۔ اس کے علاوہ شاگردوں کے کلام پر ان کی اصلاحیں اساتذہ سخن کے کلام پر ان کی تنقیدیں اسکی گواہ ہیں کہ وہ فن عروض میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ قواعد پر عبور تھا۔ محاورہ، بول چال اور زبان و بیان پر کماحقہٗ دسترس رکھتے تھے۔

ہم کو شک میں ڈال دیتی ہے صفی کی بول چال دوستو! تحقیق کرنا یہ اُدھر والا نہو......

مرے دوست جناب محمد عبدالعزیز جو اس وقت منتظم اکونٹس آفس جامعہ عثمانیہ تھے، موصوف برائے امتحان ایم۔اے اردو (آخری) ۱۹۷۵ء کیلئے جو مقالہ لکھا تھا اس کا عنوان تھا "صفی اورنگ کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ" اپنے مقالہ میں انہوں نے صفی کی چند تنقیدیں بطور نمونہ لکھی ہیں۔ ہمارا ماخذ بھی اس مقالہ میں مندرج چند تنقیدوں کا انتخاب ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صفی کوئی کتاب پڑھتے چاہے وہ نثر کی ہو یا نظم کی تو حاشیہ پر اپنی پسند یا ناپسند کا اظہار کر دیتے تھے۔ اتفاق سے اساتذہ سخن پر ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی تنقیدوں کے دو مجموعے جناب خالدی کے ہاں محفوظ تھے۔ جناب محمود علی صاحب مددگار اکونٹس آفس جامعہ عثمانیہ جناب خالدی کے دوست تھے اور انہوں نے یہ دو مجموعے اپنے دفتر کے منتظم محمد عبدالعزیز صاحب کے لئے ان سے حاصل کئے تھے۔ جناب خالدی نے ان تنقیدی مجموعوں کی واپسی کیلئے محمود علی صاحب کے نام چٹھی میرے حوالے کی۔ جب چٹھی میں نے صاحب موصوف کو پیش کی تو موصوف نے پڑھ کر کہدیا کہ یہ مجموعے میرے دفتر میں تھے جب دفتر دوسری جگہ منتقل ہوا تو معلوم نہیں یہ کہاں غایب ہوگئے۔ اس طرح جناب صفی کا ایک یادگار قلمی مخطوطے اور کمالِ فن کے شعبہ کارسے ادب کا دامن خالی رہ گیا۔ ہم جناب

محمد عبدالعزیز صاحب کے ممنون ہیں کہ کم از کم ان کے مقالے میں جناب صفی کی تنقیدیں محفوظ ہیں گو وہ مشتے نمونہ از خروارے سہی مگر یہ تنقیدیں باقاعدہ نہیں ہیں۔ دورانِ مطالعہ غلطیوں کی اشارۃً نشاندہی کر دی ہے۔

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ اتنا عرصہ
آج تک تیری جدائی میں یہ کیوں کر گذرا — حسرت

"اِتنا اور یہ"

محبت نے کی دِل میں وہ آگ روشن
کہ ہم ہو گئے جسم خاکی سے نوری

"جسم زیادہ"

مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل
پھر تو نے یاد آ کے بدستور کر دیا — حسرت

"پھر یاد آ کے تو نے"

ہے غضب ہنگامۂ فصلِ بہار اب کی برس
دل یہ کہتا ہے کہ ہوگا اختیار اب کی برس — حسرت

"اب کے برس"۔ "اب کی برس" غلط

نہ قایل ہوئے تھے نہ ہوں گے نہ ہیں ہم
بڑھاتا ہے ناحق کو تکرار واعظ

"ترتیب زمانی"

• فریب سب ہیں یہ آغازِ عشق کے حسرتؔ
وہ لیں گے اس کرم بے حساب کے بدلے

"یہ سب فریب ہیں"

نزدیک ہے کہ شوق سُنے وعدۂ وصال
سب ہائے نازیا رہے لرزاں مرے لئے
" جنباں "

بے خود ہیں جائیں گے تری محفل سے بے دھڑک
کچھ ہم یہ التماس اجازت نہیں ہے فرض
" آئیں گے "

شادعظیم آبادی

وہی رہ رہ کے گھبرانا وہی ناکام کر آہیں
بجز اس بات کے تجھ سے دلِ ناکام کیا ہوگا
" وہی ناشاد کن آہیں وہی ناکام کرتا ہے "

ہمیشہ حسرتِ دیدار پر دل نے قناعت کی
بڑے در کا مجاور تھا بڑے مرشد کا چیلا تھا
" گرو "

فانی

کہتے ہو کہ ہم وعدۂ پرسش نہیں کرتے
یہ سُن کے تو بیمار ہوا بھی نہیں جاتا
" کہتے ہیں "

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کا بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نا تماشہ میرے غم خانے کا
" جب وہ آئیں گے تو گھر کا وہ رنگ کہاں رہے گا
جسے ہم دیکھ رہے ہیں اور انکو دکھانا چاہتے ہیں "

یوں نہ قاتل کو جب یقین آیا
ہم نے دِل کھول کر دکھائی چوٹ
" چیر کر "

چلئے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ — فانی

"قرینۂ کلام سے "آؤ" "پھر" "وہ" کی جگہ اشارہ قریب"

بزمِ جاناں میں نہیں قابلِ شرکت دلِ زار
کہ یہ دیوانہ ہے کیا جانیے کیا کر بیٹھے

"ردیف حسبِ محاورہ نہیں بیٹھی۔ محاورہ کر بیٹھنا ہے۔"

وقتِ پیدائش جو گریہ تھا بدستور اب بھی ہے
ابتدا میں جو ہوا وہ عمر بھر ہوتا گیا — حفیظ جالندھری

ردیف "رہا"

مرے مر مر کے جی اٹھنے پہ کیوں اتنا تعجب ہے
کہ ہوں دل دادۂ غربت پلٹ آتا ہوں منزل سے

"وطن"

برہمن جس دن عدوئے ما و من ہو جائے گا
شمع بت خانے میں جا کر برہمن ہو جائے گی

"پھر ہمن"

اپنے آغازِ محبت پہ ہنسی آتی ہے
دل کو رہ رہ کے ہے اندیشۂ انجام ابھی — حفیظ جالندھری

"ابھی سے"

قیس و فرہاد پہ موقوف نہیں کیا معلوم
در بہ در کس کو پھرائے ہوسِ خام ابھی

"کس کس یا اور کس"

جناب محمد عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے "اس بیاض میں شاد عظیم آبادی کے

بیسیوں شعروں پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی متفرق کاغذات ایسے بھی ملے ہیں جن میں صفیؔ صاحب نے فانیؔ بدایونی۔ حفیظؔ جالندھری اور جلیلؔ مانک پوری کے اشعار پر اعتراض کئے ہیں۔

جناب مسلمؔ فرماتے ہیں کہ حضرت صفیؔ نے جلیلؔ مانک پوری کے مندرجہ ذیل شعر پر بھی اعتراض کیا تھا ؎ بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی

کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

صفیؔ کا اعتراض تھا "کر کے توبہ" میں ظرفِ زمانی غلط ہے۔ یا تو مصرعہ یوں ہونا چاہیے۔

آج توبہ توڑ ڈالی جائے گی

میں نے جناب خالدی مرحوم سے اس اعتراض کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ صفی مرحوم کے قریبی دوست سیّد عبدالباقی صاحب شطاری نے جلیلؔ کے شعر پر اعتراض کا ذکر کیا تھا۔ جناب خالدی نے یہ بات ضرور بتائی کہ صفیؔ مشاعرہ میں کسی شاعر کا کلام سنتے اور شاعر کے کلام میں کوئی سقم ہوتا تو آواز اٹھاتے وقت اپنی طرف سے اصلاح کر کے پڑھتے۔

پاکستان میں ایک تاریخ "مملکتِ آصفیہ" سنہ ۱۹۷۸ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی جس کے ناشر ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب ہیں۔ مختلف اصحاب کے اس میں مقالے شامل ہیں۔ مملکت آصفیہ جلد اول صفحہ ۲۸۲ پر جناب محمد عظیم الدین صاحب مجنت ایم۔ اے عثمانیہ کا ایک مقالہ بعنوان "دکن میں ذوقِ سخن" شائع ہوا ہے۔ جناب جلیلؔ کے بارے میں لکھتے ہوئے انہوں نے انکشاف کیا کہ ایک مشاعرے میں انہوں نے غزل پڑھی تھی جس کا مطلع تھا ؎

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی   کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

جلیلؔ کے شاگردوں نے تعریف کے ڈونگرے برسائے سامعین نے بھی واہ واہ کی۔ حضرت بہبود علی صفیؔ بھی موجود تھے انہوں نے قدرے تبدیلی کے ساتھ شعر دہرایا۔

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی   کی ہے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

"کر کے توبہ" کی بجائے "کی ہے توبہ" کی اصلاح پر صفی کے شاگردوں نے جو تعریف کی تو آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ مشاعرے کے دوسرے دِن شہر کی گلی کوچوں میں یہ بات پھیل گئی۔ اعلیٰ حضرت کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے فرمان نکالا کہ جلیل صاحب استاد شہ ہیں انہیں مشاعروں میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ آخر دم تک جلیل کو کسی نے مشاعرہ میں نہیں دیکھا۔

ہمارا خیال ہے کہ جس طرح ایک واقعہ کی کئی روایتیں ملتی ہیں اسی طرح ایک خیال کو کئی طریقوں سے ادا کیا جا سکتا ہے "بات کرنے کے ہیں ہزار طریق" اور پھر صفی اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے اشعار الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ ان کے مختلف دیوانوں میں ملتے ہیں گویا ایک بات کو کئی انداز سے کہنے میں انہیں کمال حاصِل تھا۔ اگر اُستاد جلیل کے شعر کو انہوں نے تبدیل کر کے پڑھا تو تعجب کی بات نہیں۔

خطوط

جن خوش نصیبوں کو صفی اورنگ آبادی کی ہمنشینی کا شرف ملا اور انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا وہ جانتے ہیں کہ ان کی ذات مجمع صِفات تھی۔ انہوں نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تھی لیکن فطری ذہانت اور خداداد صلاحیت انہیں قدرت کی ایسی دین تھی کہ نظم ہو یا نثر یا ان کی روزمرّہ گفتگو سب میں ان کی شخصیت کے جوہر چمکتے نظر آتے ہیں۔ وہ شاعر تھے اور شاعری ہی ان کا مشغلہ تھا۔ مضمون نگاری کا شوق نہ تھا۔ صرف ضرورۃً دوستوں اور شاگردوں کے نام خطوط، سفارشی چٹھیاں اور حکیم کو بیماری کی کیفیت وغیرہ تک ان کی تحریر کا دائرہ محدود تھا۔

برجستہ گوئی ان کی طبیعت کا نمایاں وصف تھا۔ باقاعدہ بیٹھکر خطوط نویسی نہیں کی جو کچھ لکھا قلم برداشتہ ہی لکھا۔ جس طرح کلام میں سلاست وروانی ہے سادگی ہے، روزمرہ اور محاورات کا برمحل استعمال ہے درد کی کسک ہے۔ بذلہ سنجی اور خوش طبعی ہے اس کے علاوہ طرزِ بیان کی دلکشی اور ان کا اپنا ایک خاص لب ولہجہ ایسی ہی خوبیاں ہمیں ان کی

نثر میں ملتی ہیں۔ ایک خط میں وہ خود فرماتے ہیں "ارمان ہے کہ میرے خط بھی غزلوں کی طرح چٹپٹے ہوا کریں ان کو پڑھنے والے مزے لے لے کر پڑھا کریں" حکیم عبدالقادر کو اپنی بیماری کی کیفیت لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کیفیت کی چٹھیوں پر نسخہ تجویز کرتے تھے اور اس کے ساتھ بعض وقت صفی کی شگفتہ بیانی اور ان کی طبی معلومات سے متاثر ہو کر بڑے تعریفی کلمات لکھ بھیجتے تھے۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) آپ کی جادو بیانی، دیدہ زیب خوش خطی، نکات طبی، بعض بعض خاص استفسارات کو میں اپنے قلم سے ادا نہیں کر سکتا۔"

(۲) حضرت قبلہ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے انشاء پورا ہوا۔ میں جو کچھ لکھوں تو کیا لکھوں۔ صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ ان چٹھیوں کو محفوظ فرما دیجیے تاکہ مجموعہ رقعات صفی کا کام دے۔ صبح چھ بجے سے مکان پر اور اب دواخانہ پر مرضاء کا تسلسل برابر رہا ہے۔ اس سے دل و دماغ پر جو انقباضی کیفیت کی ابتدا ہو رہی تھی اور بعض مرضاء کے بے موقع استفسارات نے خیالات کو مکدر کر دیا تھا آپ کی پُر لطف تحریر نے انبساط پیدا کر دیا۔ بس اب ختم کرتا ہوں"

جناب صفی کے تیس چالیس خطوط اور کچھ تحریریں جو ہمیں دیکھنے کو ملے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان خطوط وغیرہ کے بارے میں اتنا بتانا ضروری ہے کہ محترم خالدی صاحب جناب صفی کے خطوط شائع کرنے کا بڑا ارادہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اس کام کی ابتدا بھی کر دی تھی۔ خطوط جمع بھی ہوئے۔ صفی اس وقت بقید حیات تھے انہوں نے بھی چند خطوط جناب خالدی کو فراہم کئے تھے۔ کالج کی مصروفیت کی وجہ جناب خالدی خاطر خواہ دلچسپی نہ لے سکے اس دوران صفی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح بات یہیں پر ختم ہو گئی اور یہ اہم ادبی کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن ایک یادگار کارنامہ جناب خالدی نے یہ انجام دیا کہ جو کچھ خطوط اور تحریریں فراہم ہوئی تھیں انہیں ادارۂ ادبیاتِ اردو (حیدرآباد) میں محفوظ کرا دیا۔ راقم الحروف نے انہی خطوط سے استفادہ کیا ہے۔ میرے دوست جناب سیّد عبدالحفیظ صاحب نے بھی از راہ مہربانی دو کارڈ مجھے دیے جو جناب صفی نے ان کو لکھے تھے۔

خطوط کاتب کی شخصیت کا پرتو ہوتے ہیں اس کی خوبیوں، کمزوریوں، خیالات و کیفیات اور حالات زندگی کی منہ بولتی تصویریں۔ چند خطوط پیش خدمت ہیں، یقیناً آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے کہ اگر وہ باقاعدہ نثر نگاری کرتے تو طرزِ خاص کے ادیب ہوتے۔ ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ صفی کے والد حکیم میر الدین صاحب کا انتقال سنہ ۱۳۴۶ھ کمان ساجدہ بیگم (مغل پورہ) سے متصل مکان میں ہوا تھا۔ والد کے انتقال کے بعد وہ چندے اسی مکان میں مقیم رہے۔ اس اثناء میں وہ بیمار ہوئے درد گردہ وغیرہ کی شکایت تھی۔ اپنی کیفیت کی چٹھی روزانہ حکیم عبدالقادر صاحب مددگار مہتمم دواخانہ تالاب میر جملہ کو ذریعہ جناب خالدی بھجواتے تھے۔ جناب خالدی اس وقت میٹرک میں زیر تعلیم تھے لیکن صفی سے مخلصانہ روابط کی وجہ ان کے کے ضروری گھریلو کام بڑی سعادت مندی سے انجام دیتے تھے۔

(۱) مکرمی محترمی معظمی دام عنایتکم:

تسلیم: والدہ کی دوا پہنچی اور کل ہی سے طبیعت میں سکون اور مرض میں افاقہ شروع ہوگیا۔ شافی مطلق تدبیر میں قدرت اور تجویز میں شفا زیادہ کرے۔ اِس کرسی پر دیکھوں جہاں اِس فن کی ترقی ختم ہوتی ہے۔ آمین۔

ایں گُل دیگر شگفت۔ اگرچہ میں قدیم نیاز مند نہیں کوئی خاص حقوق نہیں رکھتا۔ مگر آپ کی عنایات نے دِل بڑھا دیا ہے۔ نہ کہنے کی باتیں بھی لکھنے کی جرأت ہوتی ہے۔

مرض یہ ہے کہ میرا کیا میرے آگے آیا ہے۔ اب سمجھئے شہر بھر میں صفیؔ صاحب حضرت مشہور ہوں۔ ناز م باین ریش و فش . . . .

حضرت! شاعر ہوں۔ بس جان لیجئے کہ مفلس ہوں، آوارہ ہوں۔ خانگی علاج کراؤں تو روز روپے بارہ آنے کی ٹیکس کہاں سے بھگتوں۔ عنایت کا نہیں رحم کا امیدوار ہوں۔

خاکسار

صفیؔ اورنگ آبادی

(۲) ۲۸ شعبان ۶ھ

۱۰ ساعت روز دوشنبہ

قبلہ! تسلیم!

آپ مجھے خواہ مخواہ چھیڑتے ہیں شاید منشا یہ ہوتا ہوگا کہ کچھ نہ کچھ کہوں۔ کاغذ کی کمی نہیں، سیاہی کا قحط نہیں۔ قلم پتی کا ہے وہ نہیں گھستا۔ لیکن پریشانی میں کوئی کام بھی ہو نہیں سکتا۔

غور فرمائیے کہ بیماری میں بیماری۔ مرض میں مرض۔ یہ حاتم کی داستان ہے یا کلیلہ دمنہ کا قصہ یا چوہے کی کہانی۔ گردے کا درد پیچھے پڑا ہے۔ جھک کے چلتا ہوں زمانہ نازک ہے۔ پیٹ چھیلا ہو گیا ہے۔ مگر وہ چھیکا نہیں جس میں کھانے پینے کی چیز ہو۔ اس وجع الکلیہ نے کثرتِ ادرار کے کلیئے کو پورا کر دیا ہے۔ بندہ قادر مجاز ہے لیکن یہ بندہ پیشاب کے روکنے پر بھی قادر نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی کے روکے کیا رکتا ہے۔ خدا کا فضل چاہیئے کیا عرض کروں، عرض مرض سے بڑھ گیا ہے۔ کل اس نے بڑے جوہر دکھائے۔ تکیے سے بیٹھا رہنا کچھ آرام دیتا تھا مگر اس عارضی آرام پر تکیہ کرنا بھی مفید نہیں ہوا ......

کل شام میں ایک دوست آئے۔ انہوں نے چربی سمیت گردے تل کے کھانے کی رائے دی۔ میں نے کہا تا بعض چیزیں میں نہیں کھاتا۔ وہ اس کو کج بحثی سمجھ کر منقبض ہو گئے اور چلا گئے۔ میں ایسا کہاں تھا کہ لاتا۔ بٹھاتا۔ سمجھاتا۔ مناتا گذشتہ را صلوٰۃ۔

سنئے! بد ہوں لیکن بد پرہیز نہیں ...... اگر بد پرہیزی سے کسی خاص طرف اشارہ ہے تو میں آجا کہاں سکتا ہوں شہر کے باہر جانا اور شہر بدر ہونا برابر سمجھتا ہوں۔ کئی دن سے فریاد کر رہا ہوں کہ مجھے بلغم شورہ ہو گیا ہے اور اس کے جواب میں یہی سنتا ہوں کہ بد پرہیزی کی ہوگی۔ میں شاعر ہوں مگر جھوٹا نہیں ہوں۔ بس پیشکاری میں بھی ملازم ہوں۔ مگر جیب خاص کا۔ نوکری اور خانگی۔ اب کے میری تنخواہ بھی بیمار ہو گئی ہے شاید صداقت نامہ کی ضرورت ہو۔ تنخواہ تقسیم کرنے والا مصدی گویا وہ اندھا ہے جو ریوڑیاں بانٹتا ہے مگر اپنے والوں کو....

زیادہ حدِ ادب۔

صفی اورنگ آبادی

۲- مہربانِ صفی! از یدِ کرمکم۔ تسلیم۔

میں آپ کو مسیح تو کیا رشکِ مسیح لکھوں۔ مگر شاعر ہوں اور ہم بے ہدوں کی اصطلاح میں اس کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ اس لئے طبیب جانتا ہوں اور تدبیر و تجویز کی ندرت کو دل سے مانتا ہوں۔ اس نثری مدحیہ قصیدے کی تمہید کا تخلص ہے کہ بہ فضلِ ایزدِ باری والدہ کا بخار ٹوٹ گیا اور باری نہیں آئی۔ اب نہ گردے کی شکایت ہے نہ بخار کا شکوہ لیکن ہونٹوں پر تپ خالے پڑ گئے ہیں اور مہر بہ لب بن کر مانعِ تکلم و موجبِ تکلیف ہو گئے ہیں۔

اُردو کا محاورہ ہے "منہ میں گھنگنیاں بھر کر بیٹھ رہنا" یہ ایسے مقام پر کہا جاتا ہے۔ کہ کوئی گفتگو نہ کر سکے اور کسی عارض کی وجہ مجبوراً چپکا بیٹھا رہے۔ خاقانیٔ ہند علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

نہ ڈال آبلے اے گرمیٔ فغاں مُنہ میں
کہ چپکے بیٹھ رہوں بھر کے گھنگنیاں مُنہ میں

ذرا گھنگنی اور آبلے میں تشبیہ تام ملاحظہ ہو۔

میں آپ کو ایک مریض کی کیفیت لکھ رہا ہوں۔ کسی اپنی کتاب کا دیباچہ یا مقدمہ نہیں جس میں شاعری سے استناد کروں لیکن اس سے مقصود صرف ایک کیفیت کا دل نشین کرانا مدِ نظر ہے اور کچھ انبساط خاطر بھی......

میں نے ایک جگہ لفظ بے ہدی لکھا ہے۔ عام لوگ اس میں واو (و) کی زیادتی کرتے ہیں اور "بیہودہ" لکھتے ہیں مگر تحقیق یہ ہے کہ ہدیٰ کی نفی بے ہدیٰ ہے یعنی غیر ہدایت یافتہ دیکھئے "دماغ بے ہدہ پخت و خیالِ باطل بست" کثرتِ استعمال نے ہے (ہ) کے پیش کا اشباع کر کے واو (و) کی صورت پیدا کر لی اور بے ہدیٰ کو بے ہودہ بنا ڈالا۔

یہ تو میری خود فروشی تھی۔ یا خود فراموشی یہی ہے کہ...... میں بھی بیمار ہونے کے قریب ہو گیا ہوں۔ انشاءاللہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں حاضر ہو ہی جاؤں گا۔

آثار کہہ رہے ہیں کہ بچنا محال ہے۔

فقط

خاکسار

صفیؔ اورنگ آبادی

محترم خالدی صاحب نے فرمایا کہ یہ خط ان سے متعلق ہے اس زمانے میں وہ حکیم صاحب کے ہاں سے جناب صفیؔ کے لئے دوا لانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔

(۴) مخدومی مکرمی دام عنایتکم۔ تسلیم۔

آج کچھ لکھنا نہیں۔ اچھا ہوں، دعا کرتا ہوں۔ مگر ایک بات لکھنی ہے۔ رکتا ہوں ڈرتا ہوں۔ شرماتا ہوں۔ آپ کی کم فرصتی کا خیال۔ انہماک کا عالم۔ مریضوں کی کثرت۔ یہ سب پیش نظر ہیں۔ خدا کے لئے آپ خفا نہ ہوں اور ہونا ہے تو مجھ پر خفا ہو لینا۔ یہ بے چارے مری دوا لاتے ہیں۔ میٹرک پڑھتے ہیں۔ آج سے ان کا سلیکشن ہے۔ ذرا ہفتہ بھر تک کم فرصت ہیں میری دوا جلد مل جایا کرے تو عنایت ہوگی۔ ایسی تحریر ایک احساس آدمی ہونی چاہیئے تھی مگر میں کیا کروں ان کے ہاتھ سے دوا منگوانے کے لئے مجبور ہوں۔ مجھ پر رحم فرمائیے۔ ان سے کچھ نہ کہئے۔

الٰہی آفتاب تاثیر ادویہ تاباں و درخشاں باد

۲ر فروری ۴۷ ف

خاکسار

صفیؔ اورنگ آبادی

آمین ثم آمین۔

بہت اچھا یہ تشریف لائیں اور دوالیں } از حکیم صاحب

(۵) بھائی صاحب سلّمہٗ

آپ کو حمید لکھوں یا خیالی۔ شاعر سمجھوں یا صیغہ دار نظامت امور مذہبی۔ حیدرآبادی گنوں یا اجمیری۔ اپنا دوست جانوں یا رشید کے ابّا۔ یہ آخری بات ہی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ مجھے اس سے بہت اُنس ہے اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ رشید آپ کا خلف الرشید ہے

مخدومی مکرمی سطاعی دام عنایتکم

تسلیم

آج کچھ لکھنا نہیں اچھا ہوں دعا کرتا ہوں - مگر ایک بات لکھنی ہے - رکتا ہوں - ڈرتا ہوں -
شرماتا ہوں - آپ کی کم فرصتی کا خیال - انہماک کا عالم - مریضوں کی کثرت -
یہ سب پیش نظر ہیں - خدا کے لیے آپ خفا نہ ہوں - اور ہونا ہی تو مجھ پر خفا ہو لینا -
یہ بے چارے میری دوا لاتے ہیں - میٹرک پڑھتے ہیں - آج سے ان کا
سلیکشن ہے - ذرا ہفتے بھر تک کم فرصت ہیں - میری دوا جلد مل جایا کرے تو عنایت
ہوگی - ایسی تحریر ایک بے احساس آدمی کی ہونی چاہیے تھی مگر میں کیا کروں ان کے
ہاتھ سے دوا منگوانے کے لیے مجبور ہوں - مجھ پر رحم فرمائیے - ان سے کچھ نہ کہیے -

الٰہی آفتاب تاثیر ادویہ تابان و درخشاں باد - ۲ فروری ۸۰ء

خاکسار

عکسِ تحریر

میری طرف سے (مجھے یاد آنے والے کی) دیدہ بوسی کیجئے، پیشانی چومئے، ایک ہلکی سی تھپڑ مار دیجئے اور جب منہ بنانے لگے تو فوراً کلیجے سے لگا لیجئے۔ خداوند کریم آپ سب کو موسمی خرابیوں سے محفوظ و مصون رکھے۔

جاوش سے ملنا چاہتا ہوں۔ نہیں معلوم کثرت کار ہے، ہجوم افکار۔ ان سے ملنا ہی نہیں ہو رہا ہے گھر پر گیا نہ ملے، مطبع پر گیا ندارد...... آپ کے ملنے کی بڑی توقع تھی یہ نہ پوچھئے کیوں تھی، کس لئے تھی۔ ہاں یہ پوچھئے کہ اب کیا چاہتا ہوں تو عرض کروں گا۔

"صرف آپ کا ملنا" اگر ملنے کے لفظ کی تاثیر درست اور معشوق دونوں پر مساوات کے ساتھ اثر کرتی ہے تو مجھے ناامید ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ تیرہ چودہ سال کا تجربہ ہے کہ میں ایک شخص سے ملنا چاہتا تھا اور اس کی ملاقات پر ہمیشہ مجھے جہاں استادِ مرحوم کا یہ مطلع پڑھنا پڑا۔

دو دن بھی کسی سے وہ برابر نہیں ملتا　　　یہ اور قیامت ہے کہ مل کر نہیں ملتا

اگر آپ کا جی چاہے فرصت ملے، یاد رہے تو آسانی کے ساتھ شام کے بعد دارالمطالعہ مسجد چوک میں مل سکتے ہیں۔　خدا کے لئے ضرور ملئے

صفی اورنگ آبادی

(۶) ۲۳ مہر ۳۵ ف صبح یکشنبہ

خدمت جناب مولوی میر یاور علی صاحب منیجر امین کوکل نندڑ

ضلع عثمان آباد (دکن)

مجھ پر خدا کی مار! آپ کا خط ۹ مہر کو ملا۔ ہر روز کہتا ہوں آج تو فرصت نہیں، کل ضرور جواب لکھوں گا۔ اسی آج آج، کل کل میں چودہ دن گذر گئے۔ ہائے "عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے" "صبر تو نہیں۔ جبر تو نہیں" والے شعر پڑھ کر تڑپ گیا۔ یعنی پہلے میں "آہ" بے ساختہ نکلی اور دوسرے میں "بت" بے نیازانہ شان سے بیٹھا ہے۔ حضرت جہاں استادِ مرحوم نے خوب فرمایا ہے "یہ بھی کہنا یہ پھر ارشاد کرنا"!

نہیں معلوم "عن قریب" آپ کے پاس کتنی بڑی مدت کا نام ہے، کیا اب بھی "عن قریب" ہی

جواب ملے گا۔ اگر اس میں بھی شاعری مقصود ہے تو "سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"۔
ارمان ہے کہ میرے خط بھی غزلوں کی طرح چھپے ہوا کریں۔ ان کو بھی پڑھنے والے مزے
لے لے کر پڑھا کریں۔ مرحومین میں غالب تو موجد ہی ٹھہرے مگر محمد حسین آزاد اور نذیر احمد بھی بے تکلف
روزمرہ محاورہ لکھنے کے بادشاہ تھے۔ بیان کا اثر اور زبان کا چٹخارہ ہر رنگ میں ایک سا ہوتا ہے۔
"یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ"۔

خواجہ حسن نظامی بھی اس قحط الرجال میں غنیمت ہیں مگر یہ پیر و مرشد ایسی اردو بھی
لکھتے ہیں کہ پوربی منہ تکتے رہ جائیں۔ دعا فرمائیے خدا اطمینان دے اور سامان دے! اس
داروغۂ جنت (مکرمی رضوان) اور خدمت عوض صفی صاحب قبلہ کو میری طرف سے جھک کے
سلام آپ کا خط مجھے جس توسط سے وصول ہوتا ہے وہ ہرن کے کباب والا نہیں جو کباب
ہرن ہو جائیں کاغذ ختم۔ تحریر القط۔ آرزو باقی۔

صفی اورنگ آبادی
عن قریب

(۷) محمود میاں!

اگر آپ اجازت دیں تو میں غصہ ہو جاؤں اور کچھ دن خفا رہوں مگر یہ خفگی
آپ کی سی نہ ہوگی۔ بے منائے میں من جاؤں گا اور پھر صفی بن جاؤں گا۔ استاد کو خدا غریقِ
رحمت کرے۔ ہاں! ایسا بھی ہوتا ہے۔ ؎

بگڑ کر حضرتِ دل آپ کیا بنا لیں گے — انہیں یہ زعم ہے ہم روٹھ کر منا لیں گے۔

دیکھئے کسی سے زبان لینا، پکا اقرار کرنا، گھر پر بلانا اور خود گھر میں نہ ملنا وہ کیا بات ہے
میں خوش آیا تھا ناخوش لوٹا ؎

چوں غریب دردمندے بدرت رسیدہ باشد — چہ قدر طپیدہ باشد کہ ترا نہ دیدہ باشد

ذرا چاند سے پوچھ کر جواب دیجئے۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرح متین۔

صفی

(۸) پیر و مرشد!
محبوب بیگ صاحب سے آپ نے میرا مزاج کیوں پچھوایا۔ اب تو بے تکلفی سے بھی

نہیں کہہ سکتا "کرد بیمار برا حسرت پرسیدن تو" وہ غالب تھا کہ اب کسی بات پر مجھے
تو اب آپ پر اکثر ہنسی آتی ہے کہ آخر ہوں کیا۔ کتاب ہوتا تو چھاپنے کی غلطی سمجھتا۔ اب
اپنی بےساختہ صادر ہونے والی غلطیوں کی گفتگو کس سے کروں توبہ! توبہ!!! جو کچھ ہوا
اچھا ہوا۔

طبیعت میں فطرتاً روانی ہے مگر سوادی کا بریک ابھی تک نیا اور چالو ہے جو دریا کے لئے
سدِ سکندری ہے تو نظر کے لئے آسمانِ مدِ نظر۔ مضمون نگاری مقصود نہیں۔ مجھے بخار ہے
ہذیان ہوتا ہے تو...... اس لئے خطا ہو تو معاف فرمایئے اور اصلاح کیجئے۔ ہاں قلندر کی
شاعری بھی قلندرانہ آپ کو سلام طرفہ بلا کو رام رام۔

صفی اورنگ آبادی

(۹) موسومہ خنجر صاحب۔

اسلام علیکم۔ آپ کا کارڈ مل کر ایک گھنٹہ ہوا آپ نے میرے لئے دعا کی ہے
میں آمین کہتا ہوں۔ صاحب! لفظ "غیر قورمہ" نہیں شیر خرما ہے۔ حسن نظامی حیدرآباد کے
سفر نامہ میں روتے ہیں کہ یہاں کے لوگ قاف کو خے بنانے میں استاد ہیں کبھی مجھ سے
ملاقات ہو تو آپ کا زیر جواب کارڈ دکھاؤں اور کہوں کہ یہاں خے کو قاف بنانے والے بھی
موجود ہیں۔ چلو ادلہ بدلہ ہوگیا..... ساقی آئے تھے اور معافی چاہ کر گئے میں نے ان کی
خطا معاف کردی۔ آخر کب تک۔ رضوان صاحب کو سلام!

۶ فروردی ۱۳۴۷ ف چہار شنبہ صفی اورنگ آبادی

(۱۰) ۲۳ آذر (بنام سید عبدالحفیظ صاحب)

مخلص سلمہ۔ تسلیم۔ آپ کا بلدہ آنا میں نے دیکھ لیا تھا۔ شکریہ جو آپ نے صفائی
کردی۔ عدیل کے دوست اور میرے تازہ شاگرد سے آپ کی مراد غالباً راغب ہو گا "معہ"
کا صحیح املا ہے "کہ مع ہے۔ ذوقی صاحب کی آپ نے جتنی تعریف لکھی ہے وہ اس سے زیادہ ثابت
ہوں گے۔ میرا سلام کہیے۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ اب وہاں اکیلے نہیں ہیں۔ حضرت اماں

دونوں کو سلام فرماتی ہیں کاش جزداں" قدمبوسی" ہمیشہ رہے جو ہر صاحب کو آپ کا سلام پہونچا دیا ہے۔
صالح چاوش سے ذرا جھجک رہا ہوں اور اسی لئے کہ خوشی سے انکا کیا عالم ہوگا۔ شمیم ۔ صمیم ۔ تاباں سے
اکثر ملاقات ہورہی ہے بچھڑو ہی، ہم ہیں بہ الخیر دُعاگو

صفیؔ اورنگ آبادی ۔ حیدرآباد مغل پورہ

طرز تحریر:- (۱) مولوی ابو محمد عمر بن یافعی کے تقاضے پر آج سے سال بھر پہلے میں نے اپنا دیوان جمع کرنا شروع کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ کلیات حضرت کیفی کے طبع کے بعد ہی اس کام کی ابتداء کردیں۔ مجھے شاعری آئے ہوئے نہیں معلوم کتنے برس گذرے مگر یہ اچھی طرح یاد آتا ہے کہ جب ہوش سنبھالا ہے شعر کہتا ہوں۔ ضرورت اور سن کے بدلنے سے مری شاعری نے ہمیشہ رنگ بدلا کیا۔ بچپن کے بعض خرافات یاد آتے ہیں تو شرما جاتا ہوں اور کبھی دوستوں سے سُنتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عاشقی بھی ایک جنون ہے مگر میں شاعری کو بھی یہی سمجھتا ہوں۔ ہاں دائمی اور دوری کا فرق ہو تو ہو مگر سنی میں ایسے شعر بھی نکل گئے ہیں جن کو پڑھ کر میں ابتک سر دھنتا ہوں۔ ایک تو سُن لیجئے ؎

کون سا آفت زدہ رہتا ہے کوچہ میں ترے — شب کو اک آواز آتی ہے الٰہی کیا کروں"

شاید مری عمر اس وقت (۱۶) سال کی تو ہوگی۔ بچپن سے خوش خط ہوں۔ اس زمانے کے اشعار کی کاپیاں میں نے سلیقے کے ساتھ بنائی تھیں، صفائی کے ساتھ لکھا تھا۔ اور جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ میری زود اعتباری سے مجھے ہمیشہ نقصان ....

سُنّی ہوں، حنفی ہوں، صدیقی ہوں، اورنگ آبادی ہوں ؎

میں تو صدیقی ہوں لیکن نام کے آگے صفیؔ — لوگ لکھ دیتے ہیں مجھ کو مرزا و میر بھی

آبائی پیشہ کے لحاظ سے حکیم ہوں۔ منشی نہیں مولوی نہیں مرفہ حال نہیں ملازم نہیں متاہل نہیں شاعروں میں سودائی ہوں اور عاشقوں میں مجنوں۔ میرا اصلی نام بہاء الدین ہے مگر ایک بزرگ نے بہبود علی نام رکھا تھا ان کی زبان کا اثر کہئے یا والدین کی پسند کہ اسی نام سے اب مشہور ہوں گھر کا نام میاں جانی ہے کیفی صاحب کی شاگردی سے پہلے میں شعر بہت کہتا تھا اور جلد کہتا تھا اور اب دیر سے کہتا ہوں کم کہتا ہوں اور پہلے کا ہے ما ہے اور نہ اب حساب دوستاں در دل ....

جناب صفی کے خطوط بہت دلچسپ ہوتے تھے اس لئے ان کے دوست اور اس بات کو جاننے والے ان کے خطوط دیکھنے کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ صفی نے اپنے ایک دوست کو خطوط کے چرا لئے جانے یا اُڑا لئے جانے کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک دلچسپ واقعہ لکھا۔

(۲) "اس کے پہلے میں نے جو خط لکھا تھا اس کا عجیب واقعہ ہے۔ غالب صاحب فخرالدین کی شادی کا سہرہ لکھوانے کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ میں تمہارے خط کا جواب لکھ رہا تھا۔ وہ بیٹھے۔ جب میں کام سے فارغ ہو چکا اور ان کی بھی غرض نکل گئی تو میں نے لفافہ بند کر کے اپنا خط بھی دے دیا کہ جاتے جاتے ٹپہ میں ڈالتے جاؤ۔ اس بھلے آدمی نے ناک کی سیدھ سے سیدھے راہ اپنے گھر کی لی۔ جب محلّے میں گزر ہوا تو شاید ان کو خط ڈالنا بھولنا یاد آ گیا۔ ایسے میں شاید محبوب صاحب بھی اپنے دفتر کو جا رہے تھے غالب صاحب نے یہ خط ان کے ہاتھ دے دیا کہ اصفی کا خط ہے ٹپہ میں ڈال دیجئے۔ (چوہے کی کہانی ہو گئی) وہ ایک ہی بزرگ ہیں ان کو تو موقع ملنے کی بس دیر ہے خط لے لیا اور کھول کے اس کی لفظاً لفظاً نقل کر لی۔ شکر تو یہ ہے کہ مرا لکھا ہوا خط پھر لفافہ میں بند کر کے ٹپہ میں ڈال دیا۔ کل بڑی مہربانی فرما کے مجھے مکان لے گئے تبدیلی اور ایک کاغذ کا پرچہ ہاتھ میں لایا۔ کہنے لگے "ہم اگر کوئی آپ کی گم ہوئی چیز دیں تو کیا دو گے" میں نے کہا کہ "دعا" اور اس سے زیادہ مرے پاس کیا ہے۔ وہ پرچہ مرے ہاتھ دیدیا۔ بس دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دیکھئے یہ لوگ ہنسی ہنسی میں گلا کاٹتے ہیں۔ احسان کیا مگر ظلم کے پردے میں۔ چپ ہو کر رہ گیا غصہ میں وہ کاغذ وہیں چھوڑ دیا کہ مجھے اس سے کچھ کام نہیں۔

قوالی کا واقعہ

جناب یقین نے "فردوس صفی" میں کلام کی مقبولیت اور رائے عامّہ کے عنوان سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

...... برصغیر ہندو پاکستان کے عوام جانتے ہیں کہ اورنگ آباد (دکن) میں سیکڑوں اولیائے کرام استراحت فرما ہیں اور ان کے سالانہ عرس بھی ہوتے ہیں اور کثیر تعداد میں زائرین اور معتقدین کا ہجوم رہتا ہے۔ محافل سماع منعقد ہوتے ہیں۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اس شہر اورنگ آباد (دکن) میں ایک سال حضرت خواجہ شمس الدین کے عرس شریف کے موقع پر جب کوئی قوال آپ کی غزل گانے لگا جس کا مطلع تھا ؎

نہیں بھرتی طبیعت لاکھ دیکھو عمر بھر دیکھو
خُدا کی شان!! ایسے بھی ہوتے ہیں بشر دیکھو

اس مطلع کے سُنتے ہی محفل سماع گرما گئی اور محفل میں ایک قیامت برپا ہو گئی اور ایک خاص سماں بندھ گیا۔ رفتہ رفتہ نہیں بلکہ گفتہ گفتہ جب گانے والے نے یہ شعر پڑھا ؎

اُسے دیکھا ہے جس کے دیکھنے کو لوگ مرتے ہیں
نظر بازو! ہماری بھی ذرا حدِّ نظر دیکھو

تو محفلِ سماع میں ایک صاحبِ وجد و حال بزرگ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ ذوق اور شوق کی حالتِ وجد میں بار بار یہی دہرائے جانے پر واصل بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت صفی بقید حیات تھے یہ خبر آگ کی طرح حیدرآباد دکن میں پھیل گئی۔ چنانچہ ہمارا اپنا خیال ہے کہ شاید اسی واقعہ سے متاثر ہو کر آپ نے یہ

یہ شعر کہا ہے ؎ لوگ مری شاعری پر وجد کرتے ہیں صفیؔ
ہاں مگر باور نہیں آتا ہے صورت دیکھ کر

(فردوس صفیؔ صفحہ ۲۴ - ۲۵)

جناب یقینؔ نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں لڑکپن تھا مگر اچھی طرح یاد ہے کہ محفل قوالی میں ایک صاحب کو وجد آیا اور پھر ان کا انتقال ہو گیا تو کچھ گڑبڑ رہی۔

راقم کے والدِ مرحوم حضرت خواجہ شمس الدین محمدؒ صاحب اورنگ آبادی کے بڑے عقیدت مند مرید تھے۔ ہر سال حضرتؒ کے عرس (۲۷ جمادی الثانی) میں ہمارا پورا گھر عرس میں شرکت کے لئے اورنگ آباد کا سفر کرتا تھا والد مرحوم اس واقعہ قوالی کا ذکر کرتے تھے۔ اس سلسلہ کے پیر طریقت حضرت معین اللہ بیگ صاحب خلیفہ حضرت اللہ کے حکیم صاحب نے بھی میری دریافت پر تصدیق کی کہ عرس قریب الختم تھا اور اس دن "بداوا" (وداعیہ) تھا۔ قوال سرور بخش نے صفیؔ اورنگ آبادی کی غزل شروع کی خوب رنگ جم چکا تھا۔ یک بارگی حضرت خواجہ صاحبؒ کے ایک مرید حافظ غلام رسول صاحب کو صفیؔ کے متذکرہ شعر پر وجد آیا۔ بار بار وہ کچھ دیر قوال سے اس شعر کو دہرانے کی فرمائش کرتے رہے اس کے بعد قبلہ رو دوزانو ہو کر بیٹھے اور درگاہ کی طرف رُخ کر کے کہا "میاں! تمہارے دیکھنے والوں کی یہ شان ہے" یہ کہکر وہ قبلہ کی طرف سجدہ ریز ہوئے۔ دیر تک اسی حالت میں رہے اور سر نہ اٹھایا تو لوگوں نے جا کر دیکھا۔ شریک محفل ایک ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر انتقال کر جانے کی تصدیق کی۔ تب ان کو وہیں چت لٹا دیا گیا مگر قوالی جاری رہی ایسے وقت حیدرآباد کے مشہور قوال اکرم الدین آکے بیٹھے اور قوالی شروع کی درگاہ کا وہ پُر اثر منظر سامنے مبہت رکھی ہے۔ حضرت خواجہؒ کے مریدوں کی وہ وجدانی کیفیت۔ جب اکرام الدین نے اپنی سُریلی دردناک آواز میں برموقع یہ پُر تاثیر شعر سُنایا ؎

اک پتنگے کی اگر جان گئی جانے دو
نام روشن تو ہوا شمع کا پروانے سے

تو محفل سماع کا سماں ایسا وجد آفرین تھا کہ ہر شخص گریبان ولہ قصان تھا۔
بعد غسل درگاہ کی مسجد میں نماز جنازہ ہوئی اور تدفین کے لیے میت خلد آباد لے گئے
وہیں خلد آباد میں مرحوم حافظ غلام رسول صاحب رہتے تھے واقعی جناب صفی کا معیار نظر تو ایسا
ہی اونچا تھا سے نظر وہ کیا نظر حد جس نظر کی آسماں ٹھیرے
نظر تو وہ نظر جو آسمان سے پار ہو جائے

مزار صفی

۱۵ رجب (۱۳۷۳ھ) حضرت صفی اورنگ آبادی کا یوم وفات تھا۔ پروگرام کے مطابق
دوسرے دن ۷ رجب ۱۴۰۶ھ (۲۹ مارچ ۱۹۸۶ء) میں اور رؤف رحیم صبح سات بجے
فاتحہ خوانی کیلئے روانہ ہوئے۔ حضرت سردار بیگ صاحبؒ کی درگاہ میں داخلہ کے بڑے
دروازے کی سیدھی جانب قبروں کا سلسلہ ہے۔ اسی طرف حضرت صفی کا مزار ہے سامنے
لاریوں کے شیڈ پڑے ہوئے ہیں اور گاڑیوں کے آنے جانے کیلئے راستہ بنا لیا گیا ہے۔ گھنی جھاڑیوں سے
دامن بچاتے اور چوطرف بکھری ہوئی غلاظت سے قدم سنبھالتے اور چند قبروں کو پار کرکے ایک جگہ
ٹھہر گئے رؤف رحیم بیسوں مرتبہ یہاں آچکے ہیں۔ لیکن اب کے وہ ادھر اُدھر حضرت صفی کی قبر
ڈھونڈتے رہے۔ سامنے ہی ایک شکستہ اور ٹوٹی قبر کی طرف میں نے اشارہ کیا ؏

شق جا بجا سے قبر ہے کس کا مزار ہے؟

رؤف رحیم چونکے۔ ارے یہ تو حضرت کا مزار ہے! علانیہ سبل لگاکر توڑی ہوئی قبر۔ کتبہ بھی اکھاڑ کر
پھینک دیا گیا ہم نے بہت تلاش کیا ملا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں کا ماحول اب بدل گیا ہے۔
"نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ وہ در کی صورت" دیوار توڑ کر راستہ بنا لیا گیا ہے۔ اسی دیوار کے
پاس پہلی قبر حضرت صفی کی والدہ" حضرت اماںؒ کی ہے۔ اس کے بعد حضرت صفی کی۔ اُدھر سے اِدھر
آنے والوں کا پہلا قدم حضرت اماں کی قبر پر پڑتا ہے اور دوسرا قدم مزار صفی پر۔
رؤف رحیم نے بتایا کہ جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست کی دلچسپی سے

سمنٹ اور اینٹ سے پختہ اور اونچی قبر بنائی گئی تھی لیکن اب اس قبر کو راستہ کی رکاوٹ سمجھکر زمین دوز کرنے کا منصوبہ بن چکا ہے۔ آثار بتارہے ہیں کہ چند دن بعد نہ یہ مزار رہے گا نہ نشانِ مزار۔

میں لاتعداد شاگردانِ صفیؔ اور ادبی انجمنوں سے التماس کرتا ہوں کہ وہ رؤف رحیم کی اپیل برائے تعمیر و حفاظت مزار اور قبر فروشوں کے ناپاک عزائم کے خلاف ان کے احتجاج مورخہ یکم اپریل ۸۶ء اخبارِ سیاست کا عملی جواب دیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر محی الدین قادری صاحب زورؔ کے بعد لے دے کے نظریں جناب عابد علی خاں پر جا ٹکتی ہیں جو حیدر آباد کے آثار اور روایات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور ادیب، شاعر اور فن کار کی حوصلہ افزائی اور ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار رہتے ہیں۔ مرحوم شعراء اور ادباء کی یادگار باقی اور قائم رکھنے کے لئے آپ کی کوشش اور دلچسپی قابلِ قدر ہے۔

روزنامہ سیاست حیدر آباد

مورخہ: ۵ اپریل ۱۹۸۵ء

تعمیر مزارِ صفیؔ اورنگ آبادی:- یقین آنے لگتا ہے کہ ضرور حضرت صفیؔ پر اپنی زندگی میں اس حقیقت کا انکشاف ہو چکا تھا کہ ان کے دُنیا سے گذر جانے کے بعد ان کو چاہنے والے اور ان کے نام لیوا ان کی قبر سے کتنی بے اعتنائی برتیں گے۔ اِس لئے انہوں نے قبر پر بسلسلہ فاتحہ آنے والے سے خواہش کی ہے کہ جو کچھ حال ان کی قبر کا وہ دیکھے اپنے تاثرات وہ بیان کرے اور اپنی رائے لکھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

جو فاتحہ کو آئے وہ لکھ جائے اپنی رائے
میری طرف سے کچھ نہ ہو لوحِ مزار پر

میں نہ حضرت کا شاگرد ہوں نہ رشتہ دار۔ بس حضرت کے کلام کا ادنیٰ شیدائی ہوں فاتحہ خوانی کو گیا تھا تو تعمیل حکم کی بجا آوری میں اپنی رائے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ کو بھی وہاں جانے کا اتفاق ہو اور موقع ملے تو اُمید ہے کہ اِنشاء اللہ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گے۔

آج سے صرف ایک ماہ پہلے مزارِ صفی پر حاضر ہوا تھا بڑی حیرت ہوئی کہ قبر کی شکستگی کا وہی نقشہ ہے جو میں نے تین چار ماہ قبل دیکھا تھا۔ اگرچہ منہدم دیوار کے پاس تھوڑی کانٹی پڑی ہوئی ہے، لیکن کانٹی ہٹا کر راستہ بنانے کی کوشش جاری ہے۔ اب تو لی لینڈ گاڑیوں کے شدِ قبرستان میں پھیلتے جا رہے ہیں اور بھاری گاڑیوں کے چاروں پاؤں قبروں کو روندتے ہوئے گذر جاتے ہیں توسیع پسندی اور آمد و رفت مزارِ صفی کے قریب پہنچ گئی ہے۔

جناب رؤف رحیم معتمد انجمن ادبستان دکن نے اخبار سیاست مورخہ یکم اپریل سنہ ۱۹۸۶ء میں حضرت صفی کی قبر کی زبوں حالی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کی تعمیر اور وہاں پھیلی ہوئی گندگی کی صفائی وغیرہ کے لئے مزار صحاب سے اپیل کی تھی اس عرصہ میں وہ خاموش نہیں بیٹھے بلکہ کئی ذمہ دار اصحاب سے ربط پیدا کر کے تعمیر مزار صفی کیلئے عرض معروضہ کیا لیکن ان کی جدوجہد کا حاصل یہ ہوا کہ ؎

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سو کے جواب میں

آخر تھک ہار کے انہوں نے ایک اور اپیل اخبار منصف مورخہ ۲۵ اگست ۱۹۸۶ء میں شائع کی اور مزار کی تعمیر اور حصار بندی کیلئے عطیات ذریعہ مالی تعاون انجمن ادبستان دکن روانہ کرنے کی درخواست کی۔ حضرت صفی کے قدیم اور قریبی شاگرد جناب شمس الدین تاباں کو اپنے استاد سے جو والہانہ عقیدت تھی ویسا ہی جذبۂ عقیدت مندی رؤف رحیم کو اپنے والد جناب تاباں سے ورثہ میں ملا ہے ان کی اپیلیں اور تعمیر مزار کے لئے ان کی کوشش حضرت صفی کے کلام کو جمع کرنے اور ان کے حالات لکھنے کی دُھن سب اسی خلوص اور عقیدت کا مظہر ہے جو ان کو حضرت صفی کی ذات سے ہے۔ ان کے اس خلوص کو کسی بدنیتی پر محمول کرنا بڑی ناانصافی زیادتی اور دکھ کی بات ہوگی۔

حضرت صفی کے انتقال کے بعد کئی انجمنیں معرض وجود میں آئیں جن کا مقصد حضرت کے نام اور کام کو باقی رکھنا ہے۔ چنانچہ یادگار صفی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ مضامین پڑھے اور لکھے جاتے ہیں نظمیں کہی جاتی ہیں اور مدح و قصیدہ خوانی کے مظاہرے بھی

ہوتے ہیں۔ واقعی یہ سب کام قابل تعریف اور لائق ستائش ہیں۔ لیکن اس وقت خود حضرت صفی کی قبر کیلئے جو...... " پھر اس قدر بھی ہمارا انسان دہے نہ رہنے کی منزل پر پہنچ گئی ہے آپ نے کیا کیا؟ زبانی جمع خرچ سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ گرہ کھلے تو کام بنے ورنہ آپ کے استاد حضرت صفی کا شعر آپ پر صادق آئیگا۔ مجھے احباب سے کیا کام بنتے کا یقیں ہوتا

یہ باتونی ہیں ان کے ہاتھ سے کچھ بھی نہیں ہوتا

ویسے یہ حقیقت ہے کہ خود صفی کا کلام ان کو حیاتِ جاوید مل جانے کی سند ہے۔ چاہے ان کی کوئی اولاد نہ ہو لیکن ان کا شگفتہ کلام ان کے نام کو رہتی دنیا تک زندہ و پائندہ رکھے گا۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا جائیگا دکن کے اس مایۂ ناز غزل گو شاعر کو نقادانِ سخن امتیازی اور اونچا مقام عطا کریں گے۔ میر و غالب کو رونے والو

اک دن یاد آئے گا صفی بھی

لیکن کیا آپ اس مٹی کے ڈھیر کو پامال ہوتے دیکھیں گے جس کا نام مزار صفی ہے؟

یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ایک مدت کے بعد حضرت صفی کے ہمشیر زادوں نے اپنا تعارف ذریعہ اخبار منصف ۲۷ اگسٹ ۱۹۸۶ء کرایا۔ مجھے امید ہے کہ حضرت صفی پر لکھنے والوں کی وہ کافی مدد کر سکتے ہیں۔ اگر وہ اپنا پتہ اور نمبر مکان لکھ دیں تو ان سے ربط پیدا کرنے کی سہولت ہو۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اپنا پتہ اخبار میں ضرور درج کریں۔ راقم کا فون نمبر 526423 ہے اور مکان نمبر 20-6-356 چبوترہ سید علی۔ اگر ملاقات کا موقع عنایت کریں تو ناچیز حاضر ہو جائے گا۔

روزنامہ منصف۔ حیدر آباد

۹ ستمبر ۱۹۸۶ء

اشاریہ

صفیؔ اورنگ آبادی پر لکھے گئے مضامین

(۱) محمد بہبود علی صفیؔ اورنگ آبادی صاحبزادہ میر اشرف الدین علی خاں مرقع سخن جلد اول سنہ ۱۹۳۵ء

(۲) ہائے صفیؔ تمکین کاظمی اخبار سیاست مورخہ ۲۴ مارچ سنہ ۱۹۵۴ء

(۳) خطوط حضرت صفیؔ بنام ابوالفیض فیاض صاحب:

یادگار صفیؔ۔ مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد سنہ ۱۹۵۶ء

(۴) آب حیات کا شاعر سید عبد الحفیظ " " " " "

(۵) کلام صفیؔ کی چند خصوصیتیں نصیر الدین ہاشمی " " " "

(۶) صفیؔ کو جیسا دیکھا جیسا پایا پروفیسر سید محمد ایم۔اے " " " "

(۷) صفیؔ کی عشقیہ شاعری محمد منظور احمد " " " " "

(۸) محاورات میں صفیؔ کا مقام ابو محمد سید علی سریہ " " " " "

(۹) صفیؔ اور ان کی شاعری منیر صفوی " " " " "

(۱۰) صفیؔ کے شاگرد نذیر علی عدیل " " " " "

(۱۱) صفیؔ پر ایک سرسری نظر خواجہ حمید الدین شاہد " " " " "

(۱۲) صفیؔ کی شاعری ہاشم حسن سعید " " " " "

(۱۳) صفیؔ کی خانگی زندگی صابر عارف زکی " " " " "

(۱۴) صفیؔ اورنگ آبادی محمد اکبر الدین صدیقی رسالہ نورس غزل نمبر ۱۹۵۸ء

(۱۵) مکتب داغ کا آخری بڑا شاعر صفیؔ اورنگ آبادی } سید مبارز الدین رفعت۔ انتخاب کلام صفیؔ اورنگ آبادی

(۱۶) عرض مرتب خواجہ شوق پراگندہ سنہ ۱۹۶۵ء

(۱۷) صفی کی شخصیت اور شاعری   اوج یعقوبی   پراگندہ سنہ ۱۹۶۵ء

(۱۸) تعارف   ۔   محبوب حسین جگر   ''   ''   ''

(۱۹) آپ سے ملئے   سید غوث یقین   فردوس صفی ۱۹۶۸ء

(۲۰) حیدرآباد کے شاعر جلد اول   مُرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد

(۲۱) صفی اورنگ آبادی   محمد شمس الدین تاباں

(۲۲) صفی اورنگ آبادی   ڈاکٹر سیدہ جعفر

(۲۳) قلندر صفت شاعر صفی اورنگ آبادی   ڈاکٹر عقیل ہاشمی

(۲۴) حضرت صفی اورنگ آبادی کی غزل گوئی   شریف یم-اے

(۲۵) صفی اورنگ آبادی-ایک صاحب طرز شاعر   ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

(۲۶) حضرت صفی اورنگ آبادی   رؤف رحیم یم-اے۔

(۲۷) صفی اورنگ آبادی شخصیت اور شاعری کا جائزہ

محمد عبدالعزیز ۱۹۷۵ء (مقالہ برائے امتحان یم-اے آخری)

(۲۸) صفی کو میں نے دیکھا بھی ہے سُنا بھی   پروفیسر سعادت نظیر

(۲۹) حضرت صفی اورنگ آبادی   پروفیسر یوسف سرمست

(۳۰) صفی بہبود علی صفی اورنگ آبادی   امجد سے شاذ تک۔

پیشکش روزنامہ سیاست حیدرآباد دکن ۱۹۸۸ء

مؤلف کی کتابیں

(۱) صاحبزادہ نواب صلابت جاہ

(۲) سوانح عمری صفی اورنگ آبادی — قیمت بیس روپے

(۳) رستم زماں گاما — زیر طبع

(۴) تاریخ و ادب (مضامین) — زیر طبع

(ملنے کا پتہ)

دیوڑھی نواب مشرف جنگ صاحب مرحوم

چبوترہ سید علی۔ حیدرآباد اے پی (انڈیا)

مکان نمبر 356-6-20

پن نمبر = 5000